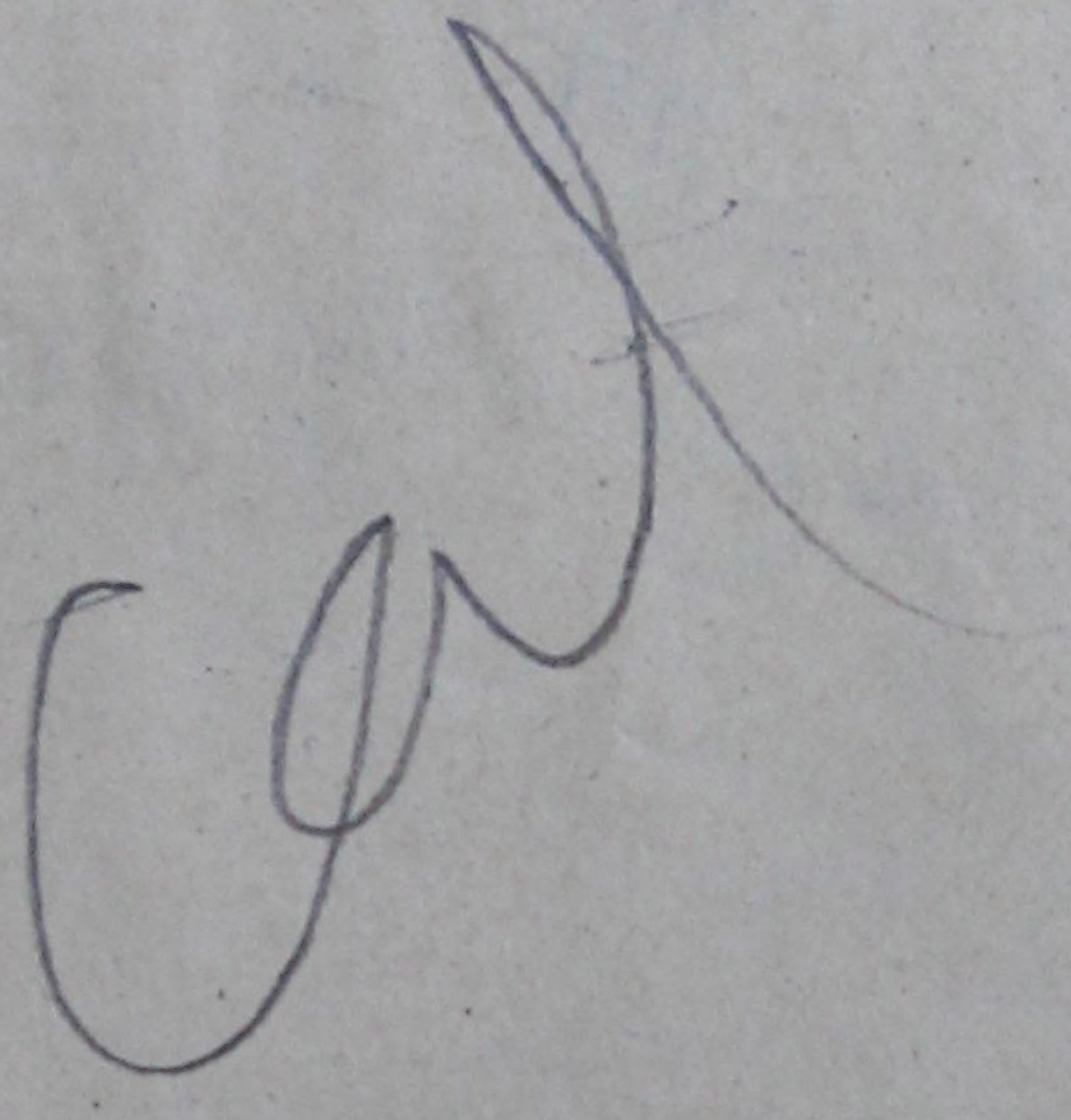
30/8/71

Mohd. Yaqub Shopriany



جنس لطیف

جنسی صحتیات

ادارۂ تربیت جنسی
حیدرآباد دکن
مارچ سنہ ۱۹۴۹ء

قیمت:- تین روپیہ آٹھ آنے

بار اول

اِدارہ کی شائع شدہ کتابیں!!!

(۱) جنس اور زندگی

(۲) قدیم ہندوستان اور جنسیات

زیرِ طبع

جنسی مسائل سوالات اور جوابات

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس
حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

متردد اور پراگندہ نسوانیت کے نام جو آسودگی
میں فرسودہ، آزادی میں مقید اور جو
شادی میں ناشاد
ہے

"عورت"

"اے عورت ہمیں زندگی، آسودگی، اور محبت عطا کر، تو اپنی محبت سے جنت کے دروازے ہم پر کھول دیتی ہے، تو اپنی محبت سے اندھے کو دیدہ ور اور دیدہ ور کو اندھا بنا دیتی ہے، تو اپنی محبت سے ہماری عقل اور ہمارے جذبات کو روشن کر کے ہمیں عجیب و غریب انعام سے سرفراز کرتی ہے۔" لیکن اے عورت کون اس بے انداز طاقت کا استعمال جانتا ہے؟ کیا تو آنکھ بند کر کے زندگی میں سے گزر جانا چاہتی ہے؟

"سب سے زیادہ تجھے یہ بات جاننی چاہیئے کہ کیوں تجھے محبت کے اقتدار مطلق سے سرفراز کیا گیا؟ جبکہ تو ہماری زندگی کے مختصر لمحے کو جنت بنا سکتی ہے تو تجھے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تو اپنی محبت کی بدولت جنت کی مسرتوں کو زمین پر لکھ سکتی ہے۔"

حرف اوّل

حیدر آباد میں تربیت جنسی کی جدّ و جہد کو شروع کئے ہوئے یوں تو تقریباً دس سال کا عرصہ گزر گیا مگر ادارہ کی شکل میں اس کی صورت گری ہو کر مشکل سے پانچ سال ہوئے اس قلیل مدت میں ادارہ جو بھی کام کر سکا اس کو عام طور سے بنظر استحسان دیکھا گیا۔ اس کے باوجود ادارہ کے پیش کردہ خدمات سے اس قدر استفادہ نہیں کیا گیا جس سے ادارہ کی توقعات پوری ہوتیں۔ میری دانست میں اس کی بڑی وجہ جنسیات سے متعلق شرم و حیا کا بیجا احساس اور ڈر ہے جس سے ہماری سماج آج بھی آلودہ ہے۔

منجملہ اور کوششوں کے جو ادارہ کے دسترس میں تھیں، جنسیات سے متعلق عام فہم کتابچے تعلیمی اور تبلیغی نقطۂ نگا
شایع کئے گئے۔ مجھے امید ہے کہ ہماری پڑھ
ایک قابل لحاظ حصہ اس سے استفا
محسوس کیا گیا کہ رائے عامہ کا ق

مطالبات کے مدنظر ایسا لٹریچر شائع کیا جائے جو ایک طرف تعلیمی اغراض کی تکمیل کر سکے اور دوسری طرف سماج کو اُن ناسوروں کے ممکنہ حد تک اندمال کی طرف متوجہ کرے جن کا خاموش وجود آلِ آدم کو مخدوش حد تک فرسودہ کر دیا ہے۔

گو مجھے اس کا یقین ہے کہ ادارہ کی اس جدوجہد میں ہر طبقۂ آبادی اور تمام مکاتیبِ خیال کے لوگ ہمارے ہم خیال ہیں مگر ادارہ اپنی گوناگوں مجبوریوں کے باعث ان تمام عصری وسائل سے کماحقہ استفادہ نہیں کر سکا جو اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔ جنس اور اس کے متعلقات ایک رازِ سربستہ بنے ہوئے ہیں اور ان کے ذکر میں لازماً بیباکی ناگزیر ہے۔ ادارہ نے اپنے ہر عمل میں اس طرز سے کبھی گریز نہیں کیا۔

منجملہ اور کوششوں کے ادارہ کی خواہش تھی کہ جنسیات کے مختلف عنوانات پر کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کرے مگر یہ [illegible]ہش کسی نہ کسی وجہ سے ادارہ کے منصوبے کے مطابق عملی [illegible] سکی۔ بہرحال اب تک جو بھی ہو سکا ادارہ کرتا رہا۔ دو کتابیں [illegible] "جنسیات اور قدیم ہندوستان" شائع [illegible] ہے جو ادارہ پیش کر رہا ہے۔

مضمون کی وسعت کے اعتبار کرتے یہ حقیر کوشش مکمل نہیں سمجھی جا سکتی صرف اُن حقائق کی طرف اشارہ کئے گئے ہیں جو سماج کے غور و فکر سے زیادہ عمل صحیح کے محتاج ہیں۔

میں نہ ادیب ہوں اور نہ پیشہ ور لکھنے والا۔ مجھے ادب کی دنیا میں اپنی بے ادبی کا اعتراف ہے۔ ادارہ کی مجوزہ سلسلہ کتب کی تاخیر و تقدیم کا خیال کئے بغیر یہ چند صفحات اس لئے شائع کئے جا رہے ہیں کہ جنس کا شخصی اور سماجی پہلو ایک تاریک گڑھا بنا ہوا ہے اور معلوم نہیں کہ ہر روز کتنے اچھے انسان دانستہ اور نادانستہ غلط کاریوں کا شکار ہو کر زندہ درگور ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے آئے دن کے مشاہدات اور معلومات کی بنا پر انسانیت کو متردد پا کر اپنے پیشہ ورانہ طرز زندگی کے رُخ کو انہی بھیانک حقائق کی طرف پھیر دیا ہے اور میرے اس طرز فکر نے میری راہ اور منزل کو معین کر دیا ہے۔ گو کہ مجھے اپنی منزل قریب نظر آ رہی ہے مگر میں اُس تک سماج کے سہارے کے بغیر نہیں پہنچ سکتا۔ میں اپنے قارئین سے تنقید اور ہدایت کا طالب ہوں اگر میری اس کشمکش میں حیات کی ابتری بہتری سے بدل سکے خواہ وہ ایک متنفس کے لئے ہی کیوں نہ ہو میری سعی مشکور سمجھی جائیگی۔

میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں مگر جو بھی کہہ رہا ہوں اس سے سماج کے سمجھدار طبقہ کی فکر و عمل متحرک ہو کر موجودہ اور آئندہ نسل کو مائل بہ بہتری کر سکے۔ عقلمند لوگ عقل سے کام لے سکیں اور ایمان والے ایماندار ہو سکیں تو اس کوشش کا بہتر بدل ممکن نہیں۔ فقط

محمد عبدالحی

The writer of this booklet is the fool of first water.
[illegible] 7/9/71

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Mohd. Yaqub Shopiany

ابتدا اور انتہا

"جو خوش قسمت عورت کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہے وہ اپنے غم والم کو قوس قزح کی رنگینیوں میں بھول جاتا ہے اور تتلیوں کے پروں سے غبار کو لے کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہوا ہر جنبش قلم سے گوہر افشانی بھی کرتا ہے۔"

تعین جنس کا مسئلہ نظری نہیں بلکہ عملی ہے جس سے بہت سے دلچسپ نظریات پیدا ہوئے۔ مثلاً ہندوستان کے قدیم علم طب سرتا اور آیوروید میں ایسے معلومات فراہم کئے گئے ہیں جو ارادی طور پر

لڑکے اور لڑکیاں پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اگر لڑکے کی خواہش ہو تو ایام حیض کے بعد عورت کو تین دن تک بستر کا پرہیز لازمی ہے۔ اُسے خاص غذا اور جڑی بوٹیوں سے تیار کیا ہوا خاص بستر استعمال کرنا چاہیئے۔ چوتھے دن نہا دھو کر لباس بدل لے اور چند خاص رسوم کی ادائی کے بعد اپنے خاوند سے نطفہ لینے کی کوشش کرے۔ یہ بھی عقیدہ مشہور ہے کہ متوقعہ لڑکے کی سیرت اُس مرد کی سیرت کے مماثل ہوگی جس پر یہ عورت اپنے غسل کے بعد پہلی مرتبہ نظر ڈالے۔ خاوند کے لئے یہ ہدایت ہے کہ وہ کسی برہمن کی خدمت میں ایک مہینہ گزارے اور "اشنان" کے روز دوپہر میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہو۔ لیکن ہم بستری سے پہلے خالص مکھن سے اپنے جسم کو مل کر خالص دودھ اور مکھن سے پکائے ہوئے چاول کھائے۔ عورت سرسوں کا تیل اپنے جسم پر ملے اور اسی تیل میں پکی ہوئی خاص قسم کی پھلیاں استعمال کرے۔ اسی طرح خاوند کو چاہیئے کہ ہر مرتبہ ایک خاص منتر پڑھنے کے بعد جفت راتوں یعنی اُس مہینے کی چوتھی، چھٹی، آٹھویں، دسویں اور بارہویں کو اپنی بیوی سے صحبت کرے۔ کیونکہ یہ راتیں اولاد نرینہ پیدا کرنے کے لئے مسعود مانی گئی ہیں۔ اگر لڑکی پیدا کرنے کی

ضرورت ہو تو صحبت کے لیئے پانچویں، ساتویں، اور نویں کی راتیں موزوں سمجھی گئی ہیں۔ ایام حیض کے اختتام ان راتوں کے بعد ہندستانی طبیب لڑکے کی خواہشمند عورت کو جڑی بوٹیوں کے عرق کے چار قطرے سیدھے نتھنے میں ٹپکا دیتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائیں۔

ان نظریات کا تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ طریقے اندھا دھند اختیار نہ کئے گئے۔ بلکہ وہ ان کے ابتدائی افکار اور مذہبی توہمات کو بھی اپیل کرتے تھے۔ خدا، فطرت، منتری اور طبیب سبھی اس تخلیق میں حصہ لیتے تھے۔ ۳۰ یوم تک شوہر کا برہمن کی حضوری میں رہنا، عورت کا پیچیدہ رسوم سے گذرنا، مباشرت کا مخصوص راتوں میں بلکہ مخصوص ساعتوں میں واقع ہونا اور آخر میں منتری کا جڑی بوٹی سے کام لینا۔

اگرچہ کہ ہم ان سب خیالات کو ایک مسکراہٹ میں ختم کردینا چاہیں گے لیکن خاص طور پر طبیب کی حکمت ان معاملات میں محض حماقت ہے۔ کیوں کہ اس کا نسخہ کامیاب نہ ہو تو سارا الزام عورت پر رہتا ہے کہ ادائی رسوم میں کچھ نہ کچھ غلطی ہوئی ہے۔ نسخہ نا لمنڈی کے مصنفین کسی قدر ذی فہم معلوم ہوتے ہیں۔

ان کی رائے میں انسان تعین جنس پر قادر ہے اگر وہ احتیاط سے کام لے۔ وہ کوئی قطعی نسخہ بتانے کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ مباشرت کے دوران میں مرد عورت کی کیفیات کے لحاظ سے جنس کا تعین ہوتا ہے۔ مرد کی شدید شہوت سے لڑکا اور عورت کی شدید خواہش سے لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ یونانی اور رومی حکیم ہیپوکرائیٹس اور گیلن وغیرہ تعین جنس کو ناممکن بتاتے ہیں۔ لیکن یہ سب اس بات کے موئد ہیں کہ جسم کے جس پہلو سے نطفہ نازل ہو اُسی سے جنس کا تعین ہو جاتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جسم کے دونوں نصف مختلف حرارتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ سیدھے پہلو میں زیادہ حرارت پائی جاتی ہے اس لئے وہ اولاد نرینہ پیدا کرتا ہے اور بایاں پہلو زیادہ سرد ہوتا ہے اس لئے وہ لڑکی کو جنم دیتا ہے مگر اس نظریئے کو اُن اعمال جراحی نے غلط ثابت کر دیا ہے جو کسی پہلو سے خصیۃ الرحم (زنانہ جنسی غدود) اور خصیے (مردانہ جنسی غدود) کو خارج کر دینے کے لئے کئے گئے ہیں۔ تاہم عورت کے جسم کے دو حصوں کے متعلق یہ خیال سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی تک برابر قائم رہا۔ اُس وقت لوگوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ اگر عورت مباشرت کے بعد ہی سیدھی طرف پلٹ جائے تو

لڑکا اور بائیں طرف پلٹ جائے تو لڑکی پیدا ہو سکتی ہے۔

ان حکیموں کے رجحان کی بنیاد لڑکے اور لڑکی کے اُس جنسی فرق پر رکھی گئی ہے جو بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگتا ہے گو جنس لطیف کی کمتری کے متعلق فیصلے کئے جا چکے ہیں اور بعض دقیع بھی ہیں لیکن عموماً عورت کی پستی کے متعلق ایسے خیالات آنکھ بند کر کے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ کم از کم جسمانی طور پر تو وہ ضعیف نہیں ہے۔ یہ فطرت کی بڑی ناسمجھی ہوتی اگر وہ افزائشِ نسل اور پرورش نسل کے فرائض ایک کمزور جنس کے سپرد کرتی۔ مرد کی جسمانی برتری کا محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ وہ روزمرّہ زندگی کی جنگ لڑتا ہے اور اپنے وضع قطع کے لحاظ سے گہوارے ہی میں جسمانی اور ذہنی نشو و نما کے اسباب فراہم کر لیتا ہے۔ یہ نشو و نما اُس کی ذاتی کوشش اور اُس ماحول پر منحصر ہے جن میں وہ غیر ارادی طور پر آنکھیں کھولتا ہے۔

لڑکی کی زندگی کا پہلا سال لڑکے کی زندگی کے پہلے سال کے مماثل ہوتا ہے۔ عموماً بچپن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ پہلا "غیر جنسی عہد" کہلاتا ہے جو سات سال تک جاری رہتا ہے اور دوسرا "جنسی عہد" سات سے

بارہ سال تک قائم رہتا ہے۔ لیکن میں ان دونوں عہدوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ لاشعوری جنسیت کی بات جُدا ہی۔ خیر کچھ ہی ہو لڑکی کے بچپن کو چار حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا جو جنسیت سے کسی طرح بے تعلق نہیں ہیں۔

۱۔ نومولود (پیدائش سے پہلے سال کے ختم تک)

۲۔ ناجنسی دور (۲ سے ۴ سال تک)

۳۔ نسائی جنسی دور (۵ سے ۷ سال تک)

۴۔ زمانہ ماقبل حیض (۸ سے ۱۵ سال تک)

ناجنسی دور کے متعلق اکثر کا یہ خیال ہے کہ بعض خصوصیات ایسی ظاہر ہوئی ہیں جن سے جنس کے متعلق قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔

نسائی جنسی دور میں شاہد اور مشہود دونوں کو ایک بیّن فرق محسوس ہوتا ہے۔ بعض ماہرین اس دور میں خصوصاً دانت نکلنے اور جھڑنے کے زمانہ میں بعض تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہیں بالغ مرد کے اور عورت کے دانتوں میں ترتیب اور قوت کے لحاظ سے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف مستقل دانتوں کی ابتدا میں بھی پایا جاتا ہے۔ لڑکی کے دانتوں سے اُن کی

مخصوص باقاعدگی اور اضافی کمیت کا پتہ چلتا ہے جو جنس لطیف کو ظاہر کرتی ہے۔ لڑکے کا سینہ چوڑا ہوتا ہے۔ لڑکی کا سینہ گول ہوتا ہے اور پستانوں میں چربی زیادہ پائی جاتی ہے جو بعد میں پستانی نمود کا باعث بنتی ہے۔ اس دور میں کولھے کی ہڈیاں پھیلتی جاتی ہے۔

یہ امر ابھی مشتبہ ہے کہ آیا اس دور میں بالوں کی نشوونما اور تقسیم میں لڑکے کی نسبت سے کوئی فرق پایا جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ متمدن لوگوں میں عورت، مرد سے زیادہ بال کی سرعت نمو اور کثرت کی طرف مائل ہے۔ چونکہ اس دور میں پورا ڈیل ڈول چہرہ مہرہ، اور جنسی اعضا بالکل نسوانی ہو لیتے ہیں اس لئے اسے محض "نسائی جنسی دور" کہتے ہیں۔

بظاہر ۸ سال کی عمر سے "زمانہ ماقبل حیض" کی ابتدا نامناسب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ صحیح ہے۔ کیوں کہ لڑکی کی جسمانی اور ذہنی، مرئی اور غیر مرئی اعمال برابر بلوغ کی طرف رہبری کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ پہلے حیض کے بعد سے چہرے پر نسائیت اعضا میں دلکشی اور آنکھوں میں جادو سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مخصوص جاذبیت بعد کی زندگی میں بڑھتی جاتی ہے۔ جسم کا

سڈول پن جو ساتویں سال سے شروع ہوا تھا، خاصا نمایاں ہو جاتا ہے ۔ کولھے کا پھیلاؤ بڑھ جاتا ہے اور ساقین کا بالائی حصہ خمیدہ ہو جاتا ہے جیسے فطرت اپنے ہاتھوں اُنھیں ڈھال رہی ہو ۔ ان سب تبدیلیوں کے باعث بعض نامعلوم عناصر (جو جرثومی خلیوں میں پوشیدہ ہیں) اور نفسی اعمال ہیں ۔

بلوغ کے تدریجی ظہور سے لڑکی کی زندگی بحیثیت عورت کے شروع ہو جاتی ہے اور اس کے سارے مستقبل کا انحصار اسی دور کی کامل نگہداشت پر ہے ۔ اس بیان کے آخری حصہ کی اہمیت کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا ۔ اسے سنہری حروف میں لکھ کر ہر لڑکی کے خوابگاہ میں لٹکا دینا چاہیئے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لڑکیاں اس طوفانی دور میں ہر روشنی اور رہبری سے بے نیاز رہنا چاہتی ہیں ۔ اس میں ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم جنسی مسائل کو شرم و حیا میں لپیٹ کر طاق میں رکھ کر بھول جاتے ہیں ۔ لڑکیاں کچھ جاننا بھی چاہیں تو انھیں ایسے پُر اسرار انداز میں سمجھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندرونی ہیجان کے متعلق کچھ سمجھ نہ سکیں ۔ لڑکی کی زندگی میں حیض کا پہلا واقعہ نہایت اہم ہے ۔ یہ بلوغت کی خارجی علامت ہے اس کے ساتھ کولھے ۔ پستان اور رانوں کی خصوصیتیں بھی زیادہ نمایاں

ہو جاتی ہیں۔

پستانوں کی نشو و نما اور عورت کے حسن سے اُن کے مختلف مظاہر کے تعلق پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کافی شہادت موجود ہے کہ پستان زمانۂ ماقبل تاریخ سے آج تک حُسن کی واحد علامت سمجھے جاتے رہے ہیں اور اُن کے اُبھارنے کے لئے کئی طریقے معلوم کر لئے گئے ہیں۔ اس اُبھار سے انسان کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ بچے کی غذا کا خزانہ ہمیشہ بھرپور رہے اور دوسری غرض یہ تھی کہ بٹنی اور اُس کے اطراف کا سارا علاقہ شہوانی بن جائے اور شہوانی جذبات اُکساتا رہے۔ اس لئے انسانیت کی عشقیہ زندگی میں جوبن کا مقام نہایت بلند ہے۔ لڑکیاں بھی غیر شعوری طور پر سینے کے اُبھار پر اپنی توجہ صرف کرتی ہیں۔ مختلف ممالک اور اقوام میں جسمانی اعضا اور جسمانی حسن کی نگہداشت سے متعلق مختلف طریقے اور رسوم رائج ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جمالیات کے ذوق میں کتنا اختلاف ہے اور تصور حسن میں کتنی لچک ہے۔ انسانیت کی جنسی زندگی میں جمالیاتی عناصر میں سے سینے کی جس قدر تعریف و توصیف قدیم ہندوؤں نے کی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے ہی محبت اور شہوانیت کا مفہوم دنیا کو سمجھایا۔ چنانچہ شہوانی ادبیات میں کوکا پنڈت کے کوک شاستر کا

خاص مقام ہے ۔ ہندوستان کے تصور حُسن کی رُو سے پستان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے ہاں چھاتیوں کے اُبھار اور دلکشی کے لئے صریح ہدایتیں موجود ہیں۔

"انٹی منی (ایک دھات کا نام ہے) اور چاول کے پانی کا مسلسل استعمال تمھاری لڑکی کے جوبن کو ممتاز بنا دے گا تاکہ وہ اپنے محبوب کا دل چُرا سکے جیسا کہ چور زر و سیم چُرا لیتا ہے" کھوپرا اور گُڑ ہمارے ہاں اب تک بلوغ کی ابتدا میں کھلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ پستان کو ایک معیار حسن گردان کر عورت کو مختلف مدارج میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

ہم سب مانتے ہیں کہ اس زمانے میں دُبلے پتلے بدن کی عورت پسندیدہ نظروں سے دیکھی جا رہی ہے اور ساری فیشن زدہ خواتین اس ریس میں اپنے سینے کو پچکانے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کر رہی ہیں۔ عورت اور بچے کی صحت کے نقطۂ نظر سے یہ فیشن ہر آئینہ لائق مذمت ہے۔ ساری قدیم اقوام چھاتیوں کی نشو و نما پر زور دیتی رہی ہیں۔ چنانچہ وحشی قبائل میں نمو یافتہ پستان چار چار سال تک بچوں کی غذا کا سرچشمہ بنے رہتے ہیں۔ دور شباب میں لڑکیوں کی تربیت کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اُن کے دل میں حیض کی

ناپاکی کا تصور جما دیا جاتا ہے اور ان کے دماغ کو قدیم توہمات سے بھر دیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کے بعض وحشی قبائل میں ایک رسم ہے کہ جوں ہی لڑکی پہلے حیض کی تکالیف سے فراغت حاصل کرے اُسے قبیلے کی ایک بڑھیا کے سامنے گھٹنوں کے بَل جُھکایا جاتا ہے اور بڑھیا ایک نوک دار پتھر سے اُس کی پیٹھ پر گہرے خطوط کھینچ دیتی ہے۔ لڑکی کی چیخ و پُکار تماشائیوں کے قہقہوں میں ڈُوب جاتی ہے۔ یہ مقدس نقش و نگار عورت کے بیش بہا زیور شُمار ہوتے ہیں۔ غرض کہ بلوغ کے اس مرحلہ پر لڑکیوں کو وحشی آبادی میں بیسیوں دردناک مراسم سے گذرنا پڑتا ہے۔

حیض کا آغاز آب و ہوا کے لحاظ سے ہوتا ہے جسمانی اور ماحولی اثرات کو بھی اس میں دخل ہے۔ حیض کے آغاز پر جسمانی تبدیلی کی پہلی علامت بٹنیوں کا نرم پڑ جاتا ہے۔ گویا نسوانی اعضائے جنس مرد کے جرثومی خلیئے کو بار آور کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ عورت کی ذہنی زندگی کا انحصار حیض کے دوران میں واقع ہونے والے اختلالات پر ہوتا ہے۔

یہ قلب ماہیت جو فطری طور پر تدریجی ہوئی ہے، اس بات کی بشارت ہے کہ عورت اپنے مستقبل کے پیشۂ اُمومت

کے لئے تیار ہے۔ یہ جسمانی انقلابات عورت کے افکار و جذبات پر بھی مؤثر ہوتا ہے اور اسے وہ کتنا ہی چھپائے یا دبا دے، وہ اپنی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اور یہ منزل بچہ ہے۔ بالغہ کی اصطلاح اس زمانے کی طرف رہبری کرتی ہے جو شادی کے آغاز، حمل، زچگی اور اُمومتہ پر حاوی ہو۔ شادی سے پہلے بالغ لڑکی صرف عورت ہے۔ شادی کے بعد عمل مباشرت سے جو جسمانی تغیرات واقع ہوتے ہیں وہ بقائے نسل کے اعتبار سے اہم ہیں۔

یہ تغیرات خارجی اور داخلی دونوں ہوتے ہیں۔ داخلی تغیرات رحمی ہوتی ہیں جو حمل کی تیاریاں کہلاتی ہیں خارجی تغیرات میں سینے کا اُبھار، دورانِ خون کی تیزی سے اعضائے جنس کی نشو و نما، چہرے اور پیٹ پر نیلی دھاریاں، نچلے پیٹ کی ضخامت اور وضع میں تبدیلی اور اس پر نیلی دھاریوں کا نمودار ہونا، صبح کے وقت پستی محسوس ہونا، خون کے دباؤ میں تغیر وغیرہ شامل ہیں اور یہ سب علامتیں ۲۸۰ دن تک کم و بیش جاری رہتی ہیں۔ اب عورت اپنی اُمومت کے منصب کے لحاظ سے مقدس بن جاتی ہے۔ لیکن حاملہ عورت کا یہ تقدس تہذیب انسانی کی سطح کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی سماج میں حاملہ کا لحاظ اور احترام کیا جاتا

اور کسی سماج میں اُسے قدیم توہمات کے تحت چڑیل اور ناپاک تصور کیا جاتا ہے۔ ایک مشہور رواج یہ ہے کہ حمل کا ساتواں مہینہ منایا جاتا ہے اور اُس روز چند رسوم کی ادائی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ بہرحال کوئی قوم روئے زمین پر ایسی آباد نہیں ہے جس کی عورتیں کسی خدا یا پلید روح کے عتاب سے بچنے کی خاطر یا وضع حمل کو سہل بنانے کی اُمید میں ایسے مہمل رسوم میں حصّہ نہ لیتی ہوں۔ یہ حالاتِ موجودہ ان توہمات کی جگہ ضعف، خراب غذا، اور فقدان صحت نے لے لی ہے جو ایک حاملہ کی نیند اُچاٹ کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

واضح رہے کہ حاملہ عورت کا ذہن ہر قسم کے اختلال اور صدمہ کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ اُسے یہ بات بتا دینی چاہیئے کہ حمل کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ ایک فطری وظیفہ ہے جس کے ذمہ دار بھوت یا پلید روح کے بجائے صرف انسان ہے جو خدا کی خلّاقی کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس طرح اس برکت کا موجب خدا ہی ہے۔

وضع حمل کے وقت دردِ زہ اور پیچیدگیوں کا خوف حاملہ عورت کو کھائے جاتا ہے۔ لیکن طبعی عورتوں میں ۹۵ فی صد

زچگیاں طبعی ہوتی ہیں۔ دردِ زہ کے موقع پر حاملہ عورتیں عموماً چیخ چیخ کر کہتی ہیں کہ "اب نہیں چاہیئے" لیکن زچگی کے بعد ہی اُن کا یہ کیف جذبی ختم ہو جاتا ہے۔

فطرت کس قدر عجیب ہے۔ حیوانوں اور انسانوں میں کتنا فرق ہے۔ حیوان کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے تھنوں میں اپنی غذا کا خزانہ پا لیتا ہے۔ انسانی بچے کو دو تین روز تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ماں بن جانے کے بعد عورت کو چاہیئے کہ وہ اپنے جنسی اعضاء کو (جو حمل کے زمانے میں شدائد کو برداشت کرتے رہے ہیں) کافی آرام پہنچائے۔ یہی تقاضائے عقل ہے کہ شوہر اور بیوی کو "نئی ماں" کی صحّت کی خاطر اپنی جنسی خواہشات کو دبا دینا چاہیئے۔ جب زچہ پن ختم ہو جائے اور طبعی زندگی عود کر آئے تو ایک نیا ورق اُلٹتا ہے جسے عہدِ امومت کہتے ہیں۔ اس کا دوران ایک سے ڈیڑھ سال تک رہتا ہے یعنی جب تک کہ بچے کی بے بسی دور نہ ہو جائے۔ اس مدت کے ابتدائی حصّہ میں ماں کی ساری توانائیاں بچے کی نگہداشت میں صرف ہونی چاہئیں۔ میرا روئے سخن حقیقی ماؤں کی طرف ہے نہ کہ ان "ماؤں"

کی طرف جو جن لیتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں کہ اگر انھوں نے دس ہفتے اپنے بچے کو دودھ پلا لیا تو گویا بچے پر بڑا احسان کر دیا۔ ایک حقیقی ماں ان صعوبتوں کو آیات رحمت سمجھتی ہے۔

اس زمانہ میں چھاتیاں دودھ سے چھلکنے لگتی ہیں اور جسم کے سارے پیچ وخم نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جب تک کہ عورت اس دور سے نہ گذر جائے اس کی جسمانی نشو ونما مکمل نہیں ہو سکتی۔

عورت کی جسمانی زندگی میں ایک اور انقلاب آتا ہے جس کے خوف سے وہ ہمیشہ لرزتی رہتی ہے۔ یعنی ۴۰ سے ۵۰ سال کی عمر تک کسی وقت بھی حیض کا بند ہو جانا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں عورت بحیثیت عورت کے مر جاتی ہے اور اسی موڑ تک اُس کا سفر تیزی سے بلا خلل جاری رہا جس کا آغاز بیس سال کی عمر سے ہوا تھا اور پینتیسویں یا چالیسویں سال تک آندھی بنا رہا۔ حیض بند ہو جانے کے بعد اس کی جنسی سرگرمیاں سرد پڑ جاتی ہیں لیکن اس کلیے میں استثنائی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض عورتیں فیشن کی دلدادہ بن جاتی ہیں اور غازوں سے چہرے کی جُھرّیوں کو چھپانے کی سعی کرتی ہیں۔ مگر بڑھاپا چھپ نہیں سکتا۔

بڑھاپے کے اعتبار سے بوڑھے اور بڑھیا میں جسمانی طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ البتہ مرد کی ذہنیت اور عورت کی ذہنیت میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ مرد میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اُس نے کارزیں کو اچھی طرح سر انجام کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے اُسے اب خاموشی کے ساتھ چین کرنا چاہیئے۔ لیکن عورت کو عموماً از سرِ نو جوان بننے کی دُھن لگ جاتی ہے اور اگر جوان نہ بن سکے تو کم از کم جوانوں کی صورت بنا لینے پر وہ مجبور ہو جاتی ہے

میں نے کوشش کی ہے کہ عورت کی جسمانی زندگی کو مہد سے لحد تک اس چھوٹی سی کتاب کے اغراض کے لئے نہایت مختصر طور پر بیان کر جاؤں۔ آخر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ عورت فطرت کے سارے معجزات میں بہت زیادہ تخلیقی ہے۔ اُس کے جسم کا ہر وظیفہ اور اُس کے اعضا کے نشو و نما کی ساری تفصیل بڑی پُرکاری کے ساتھ مرتب کی گئی ہے تاکہ مقصد تخلیق کی تکمیل ہو سکے۔ اُس کی زندگی میں بہت سی پیچیدہ آئین بھی موجود ہیں مگر اُن سب کی باگ ایک اعلیٰ قوت کے ہاتھ میں ہے جو اُسے اپنے عظیم ترین فرض یعنی بقائے نسل انسانی کے لئے تیار کر دیتی ہے۔

جنسی توانائی

جنسی قوت کا ہر زمانہ میں لوہا مان لیا گیا ہے۔ یوگی، بُدھی، مصری، یہودی، نو فلاطونی اور عہد وسطیٰ کے فلسفی سبھی نے جنس کو زندگی کا مرکز تصور کیا جو تدریجی طور پر ہمارے زمانے میں ایک علم کی حیثیت میں ترقی کر گئی۔

جنس کی تعریف ابتداء میں یہ کی جاتی تھی کہ جنس مرد عورت کی خصوصیات میں تمیز کا نام ہے یا مرد و عورت کے وظائف میں امتیاز پیدا کرنے کو جنس کہتے ہیں۔ بعد میں یہ تعریف اس طرح

بدل گئی کہ جنس مرد و عورت کے اُن وظائف کا نام ہے جو اپنے پہلے اور دوسرے مظاہر یعنی جنسی اور تناسلی قوتوں اور سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

فطرت کی مصلحت جنس کی جسمانی میکانیت میں صرف اتنی ہے کہ نوع کی افزائش اور بقا جاری رہے۔ اس میکانیت کے ساتھ عجیب و غریب انداز میں جسمانی، ذہنی اور جذباتی خصوصیات مربوط کردی گئی ہیں تاکہ یہ مقصد پورا ہو اور نوع انسانی بجھنے نہ پائے جنسی جبلت تخلیقی ارتقا میں زیادہ سرگرم رہی ہے اور زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے بھی وہی ہے۔ جنس کی اصلیت ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔

مرد زیادہ سرگرم، زیادہ متنوع اور خاص طور پر جنسی ہے۔ عورت منفعل اور قدامت پرست ہے اور بہت کم طبعی معیار سے گرتی ہے۔ جنس کی اکتسابی خصوصیات سے مراد وہ خصوصیات ہیں جو اصلی اور نمایشی نہ ہوں بلکہ ضمنی اور عارضی ہوں۔ جیسے جنسی حسن اور جنسی انتخاب۔ جنسی انتخاب میں ہمت، استقلال قوت، ڈیل ڈول، ہر قسم کے ہتھیار جیسے آلات موسیقی (جسمانی مصنوعی) چمکیلے رنگ، دھاریاں، نشانات اور زینت بڑھانیوالے

زیور شامل ہیں، جو بالواسطہ محبت اور رقابت کے اثرات کے تحت نمودار ہوئے۔ حسن کی تلاش آواز، رنگ اور صورت میں محض عصبی نظام کے نشو و نما پر منحصر ہے۔ اپنے رقیب سے لڑنا اور اسے شکست دے کر مادہ پر قبضہ جمانا۔ یہ سب ترغیبات جنسی ہیں۔ اگر جنس کا خاتمہ ہو جائے یا کم از کم اس کا مظاہرہ ایک موسم تک نباتاتی زندگی میں رک جائے تو کیا ہوگا؟ ساری حیوانی زندگی ختم ہو جائے گی اور ختم ہونے سے پہلے ہم نہایت حسرت سے اس دنیا کا نظارہ کریں گے جس کو حسن و جمال سے محروم کر دیا گیا ہے اور اب ہمارے ذوق نظر اور مشام کے لئے اس میں کوئی جاذبیت موجود نہیں ہے۔ چونکہ عالم نباتات حقیقی اور اہم ہونے کے باوجود ہم سے زیادہ قریب ہے اس لئے ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔ مگر جب ہم ان کی عدم موجودگی کا تصور کریں گے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ جس دنیا میں ہم رہتے سہتے ہیں اس میں جنس کی کارفرمائیاں کتنی اہم ہیں قطع نظر اس کے کہ خود ہماری شخصی زندگی میں جنس کا کیا مقام ہے۔

جنس کا اثر زندہ اشیار کی جذباتی فطرت، ان کی خواہشات اور خواہشات سے پیدا ہونے والی سرگرمیوں پر حیرت انگیز ہوتا ہے۔

جنس کا حصہ ہمارے ارادوں، جذبات اور ذہنی اعمال میں بہت زیادہ ہے۔ جنس کے بغیر کسی جاندار میں احساس خواہش، ارادہ اور عمل سے محروم ہو جائے گا۔ نسوانیت کی حفاظت، ماں بچے کی نگہداشت اور ان کی غذا کا انتظام سب کچھ اس بنیادی جبلّت تناسل پر موقوف ہے۔

جوں جوں نوع انسانی تہذیب، علم اور تجربے میں ترقی کرتی جاتی ہے انسان محبت اور تعلق کے بنیادی کیفیات میں نت نئے ذہنی اور جذباتی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ جتنا زیادہ انسان تہذیب زدہ ہوتا جاتا ہے اور جس قدر اس کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے اسی قدر پیچیدہ خصوصیات کا وہ اپنے صنف مخالف سے متوقعہ ہوتا جاتا ہے۔

جنسی وظائف کے بغیر عورت اور مرد کے درمیان سارے احساسات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہر چیز بے کیف اور پراگندہ ہو جائے گی۔ مادری اور پدری محبت خواب بن جائے گی۔ رسمِ الفت دنیا سے اُٹھ جائے گی۔ خاندانی روابط منقطع ہو جائیں گے عمرانی، تجارتی اور صنعتی زندگی سرد پڑ جائے گی۔ فنون لطیفہ کی ہیئت بدل جائے گی۔ اس کے برعکس جنس، محبت میں مرتقی ہو کر ہنگامۂ ہستی

کی باعث بنتی ہے اور دنیا کی رونق اور سرگرمیوں کو قائم رکھتی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے "محبت دنیا کی کل چلاتی ہے"۔

قدیم مفکرین نے کبھی سائنسی انداز میں غور و فکر کی زحمت نہیں کی۔ وہ ہمیشہ واقعات کی توجیہہ مافوق الفطرت زبان میں کرتے تھے۔ وہ نسل اور افزائش نسل کے جسمانی اعمال سے نابلد تھے۔ وہ صرف جنسی غدود اور اُن کے تولیدی مادوں سے واقف تھے۔ جہاں تک زندگی کے حقائق کا تعلق ہے۔ اس زمانے کے مفکرین بھی قدیم مفکرین کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ کیلاگ کہتا ہے "جنسی وظیفہ کا دُہرا مقصد ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جنسی اعضا ہمیشہ برسرِکار رہتے ہیں اور جسم کو ضروری ہیجان اور آسودگی بخشتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جنسی اعضا انفرادی زندگی اور بقائے نوع کے موجب بنتے ہیں۔ ان سب اہم وظائف میں شخصی لذت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ خودغرضی کے تحت جنسی عمل کی مشق اُس مقدس وظیفہ کی توہین ہے جس کے باعث انسان نے تقریباً وہ تخلیقی قابلیت حاصل کر لی جس کی شبیہ پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ ایک طبی اور جسمانیاتی صداقت ہے کہ خونِ جنس کی چنگاری کے ساتھ مل کر بہترین دماغ، اعصاب اور عضلات پیدا کرتا ہے۔ جنس کی رو

نظام انسانی میں داخل ہوکر انسان کو بہادری اور پامردی کی صفات عطا کرتی ہے۔ جنسی غدود کی رطوبات، دوسرے غدود کو قوت، ہیجان اور بالیدگی بخشتے ہیں جو نتیجتاً دماغ کو تقویت پہنچا کر جسمانی اور ذہنی کارکردگی، صحت و طاقت کا موجب بنتے ہیں۔ ان معیارات کو حاصل کرنے کا سنہری اصول یہ ہے کہ ورزش، اعتدال و ضبط نفس سے کام لیا جائے اور جنسی تحریک کو تخلیقی توانائی میں ڈھال کر ذہنی اور جسمانی تخلیق کی سعی کی جائے۔ اس طرح جو صداقت روشن ہوگی وہ ہمیں آزادی دلا سکے گی۔ ہمارے اسلاف نے اسی کی تبلیغ کی اور وہ اسی پر عمل پیرا رہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ تحت شعوری نفس کی نشوونما ہے، باقی سارا کام فطرت پر چھوڑ دیا جائے۔

اس اُصول کے نتائج سارے تخلیقی اعمال، ایجاد و اختراع میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر معلم اخلاق اپنے پند و نصیحت کے ساتھ اس اصول کی نشر و اشاعت شروع کر دے تو اُس کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ سماجی پاکیزگی کے خطوط پر کام کرنے والوں کے لئے ایک وسیع میدان موجود ہے۔ جو فرق اثبات و نفی میں ہے وہی فرق عمل اور بے عملی میں ہے۔ ان لوگوں کے لئے جن کی جنسی فطرت نہایت قوی ہے اگر وہ ترغیبات کے باوجود ایک پاکیزہ

اخلاقی جنسی زندگی پسند کرتے ہیں) ایک کھلا راستہ موجود ہے۔ یہی علمی اخلاق کا بہترین طریقہ ہے کہ انسان فرض، مذہبی احکام اور سماجی اصلاح کی سپرٹ میں اپنے اطوار کو سنوار لے۔ جو لوگ اپنی نسل کی اخلاقی فلاح چاہتے ہیں اُنھیں سنجیدگی کے ساتھ نشاۂ ثانیہ کے حسب ذیل اُصول پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ مستقل نصب العین
۲۔ خواہش مسلسل
۳۔ پُر اعتماد توقع
۴۔ عزم مستقل
۵۔ متوازن بدل

مختصر یہ کہ تم ہر چیز حاصل کر سکتے ہو بشرطیکہ:۔

۱۔ تم جس چیز کے طالب ہو اُسے اچھی طرح جانتے بھی ہو۔
۲۔ تمھاری طلب سچی ہو۔
۳۔ تم کامل اعتماد کے ساتھ اُسے حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہو۔
۴۔ اُسے حاصل کرنے کے لئے بلا وقفہ سعی کرنا چاہتے ہو۔
۵۔ اس کے حصول میں اُس کی قیمت ادا کرنے کے لئے رضامند ہو۔

عورت کی نفسیات

انسانی نفسیات کے واقعات کی صحیح قدر و قیمت کی بنیاد پر قائم کرنا بہت دشوار ہے۔ ہر زمانے میں فلسفیوں نے کوشش کی ہے کہ ان واقعات کو کسی ترتیب میں رکھ کر اضافی طریقوں سے چند بنیادی اُصول قائم کئے جائیں۔ لیکن جب ان مساعی کا جائزہ لیا گیا تو نگاہ بصیرت کو تشفی نہ ہوئی اور شرم سے گردن جھک گئی کہ انسان کی جہالت کتنی عمیق ہے۔ ہر انسان کی نفسیات دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے۔ بڑا یا چھوٹا، مرد اور عورت

ہر فرد کی جداگانہ ذہنی زندگی پائی جاتی ہے۔ عورتوں کی نفسیات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "عورت کا مطالعہ" کس قدر مشکل ہے۔ قدیم فلسفی جو بڑے شوق سے اس مطالعہ میں ڈوب جاتے ہیں، ہمیشہ نفس شہوانی کے گن گا لیتے رہے۔ عہد وسطیٰ میں ایک دور ایسا آیا تھا جس میں مفکرین، عورت میں کچھ نہ کچھ نقص نکالتے تھے تاکہ اُس کی فطری محرومی کو ثابت کیا جائے۔ عہد قدیم عورت کی عظمت کا معترف تھا لیکن ہمارے دَور کا عام رجحان اُس کی تذلیل کی طرف ہے۔ جیسا کہ عہد قدیم میں سبھی عورتیں مثالی نہیں تھیں، ویسے ہی ہمارے زمانے میں بھی نیک و بد عورتیں ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہیں۔ لیکن عام طور پر عورت کا شرف مسلّم ہے اگرچہ کہ اُس کا وجود ہمارے لئے معمّہ بنا ہوا ہے۔ ہیگل کہتا ہے کہ "عورت نیم وقفہ ہے اور مرد وقفہ کامل مَرد کے متعلق تم یقین کے ساتھ اپنے مقام کو محسوس کر سکتے ہو لیکن عورت کے متعلق تمھیں آگے کچھ اور بڑھنا پڑتا ہے"۔ میں اپنے بیان کی تردید نہیں کر رہا ہوں اگر اب میں عورت کے نفس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں عورت کی ذہنی زندگی کے متعلق کوئی نئے بنیادی نظریات پیش نہ کر سکوں گا۔ فطرت کے

سب سے مُشکل معمّے کا حل سائنسدانوں کے لیئے بہت ہی دلاویز ہے۔ ہم بھی اُسے اپنے علم و قابلیت کے لحاظ سے اُس پر نظر ڈالتے ہیں۔ کیا عورت کا نفس ایک ابدی استفہامیہ نہیں ہے؟ عورت جسمانی لحاظ سے مرد کے مقابلے میں کمتر ضرور ہے۔ لیکن کھوپری اور دماغ کی جسامت اور جسم کی دیگر ضخامتیں اُس کی کمتری کو پوری طرح ثابت نہیں کرتیں، حیض، حمل اور زچگی اُس کی مدافعت اور قوت کی آئینہ دار ہیں۔ عورت کے ذہن کا اُس کے دماغ کے وزن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُس کا تعلق اُن ناقابل بیان خصوصیات اور عادات سے ہے جنھیں ہم نسوانی کمزوری سے متہم کرتے ہیں۔ یہ سب عورت کے مختلف فطری اعمال سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ حیض مباشرت، محبت، ازدواج اور اُمومت کا اُن کی ترکیب پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ انھیں عناصر کے مجموعی اثر سے عورت کی نفسیاتی نشو و نما ہوتی ہے۔ گو عورت کی ذہنی زندگی کی ابتدا بچپن ہی سے ہو جاتی ہے لیکن اُس کی مکمل نشو و نما کے لئے کافی وقت لگتا ہے۔

اب ہم اس نشو و نما کو بچپن سے بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ گو عام طور پر اسے ۷ سال تک کا زمانہ غیر اہم سمجھا گیا ہے لیکن گہرے مشاہدے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ نسوانی نفسیات کا

آغاز لڑکی کی عمر کے تیسرے سال سے ہو جاتا ہے جو غیر شعوری طور پر ماں سے بیٹی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اسی عمر کے لڑکے اور لڑکی میں نفسیاتی اعتبار سے کتنا فرق ہوتا ہے! لڑکی ماں بن کر "ننھوں" کے کھلونوں سے دل بہلاتی ہے اور لڑکا "سپاہی" بن کر اپنی برتری کا اظہار کرتا ہے۔ کس قدر لڑکا وحشی اور اُجڈ ہوتا ہے!

نمائش عورت کے کردار کی کلید ہے۔ نسوانی خصوصیات میں اس خصوصیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور عورت کی پوری زندگی میں اُس کے افعال پر چھائی رہتی ہے۔ اسی پر دیگر خصوصیات کی نشوونما ہوتی ہے جو جنسی زندگی سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔ لڑکا ہمیشہ ایک بدتمیز ننھا جانور ہوتا ہے۔ اُسے اپنے ظاہر کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ وہ کبھی آئینہ سامنے رکھ کر بال نہیں بناتا اور نہ اسے اپنے ساتھی کے لباس سے بہتر لباس پہننے کا شوق ہوتا ہے۔ اُسے اپنی ہمت اور بے پروائی پر ناز ہوتا ہے۔ اس کے برعکس لڑکی بالوں کے نئے فیتے اور "ننھے" کے نئے لباس پر لوٹ ہو جاتی ہے۔

لڑکی کی خود بینی اُس کی خودی میں مرتکز ہوتی ہے جہاں سے فطری طور پر رقابت کی سوت پھوٹتی ہے جس کا مظاہرہ ہم مکتبوں اور ہمجولیوں کے تعلقات میں ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت

۷ سے ۱۲ سال تک کی عمر والی لڑکیوں کی ذہنی زندگی کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ اس دور کے اختتام سے پہلے ہر لڑکی جسمانی، ذہنی اور روحانی حُسن کی آرزو سے دمک اُٹھتی ہے۔ مگر یہ آرزو بھی صرف اُس کی خودی کو متشفی کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ جو کچھ خوبی دوسری لڑکیوں میں پائی جاتی ہے وہ اُسے اپنی ذات میں فرض کر لیتی ہے غرض کہ عورت میں حُسن کی ایک زبردست خواہش پائی جاتی ہے اور وہ کبھی مرنے نہیں پاتی۔ ہم جانتے ہیں کہ عورت کے حُسن اور اُس کے معاشری حیثیت میں ایک تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر لڑکی میں تقلیدی تحریک بالکل غیر شعوری اور بالواسطہ عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ لڑکی انھیں سہیلیوں کی تقلید کرتی ہے جو بہت زیادہ دلفریب اور خوش لباس ہوں۔ وہ کبھی بدہیئت اور مفلس لڑکیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھے گی، اگرچہ کہ وہ تہذیب اور قابلیت میں اس سے کتنے ہی بدتر ہوں، گو بچپن عام طور پر فطری ہی ہوتا ہے لیکن اس میں یہ خوبیاں اور برائیاں بھی پائی جاتی ہیں جو اِن خصوصیات کی بنا پر نسوانی بن جاتا ہے۔

لڑکی کا کردار آنے والے دورِ نمو میں خاصا تبدیل ہو جاتا ہے۔

لڑکی اپنے نکھار اور اپنے لباس کے غرور میں چُور نظر آتی ہے۔

وہ اپنی سہیلیوں پر رشک کرتی ہے اگر اُن کے سینے اُس کے سینے سے زیادہ اُبھرے ہوئے ہوں۔ اب ہم اس کی نفسیاتی بنیاد معلوم کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔ یہ رشک خود نمائی سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں کو پسند آنے کی خواہش مثالی کے طور پر حسین بن جانے کی تمنا اور جوان دکھائی دینے کی ارادی کوشش ہر نوخیز لڑکی میں پائی جاتی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے اُس کی نشوونما مکمل ہوتی جاتی ہے اب وہ ہر شخص کی نظر کو اپنی طرف مائل کرنا شروع کر دیتی ہے۔

پہلے حیض سے قبل لڑکی جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بچہ ہی ہوتی ہے لیکن اُس کے بعد اس کی ماہیت بالکل بدل جاتی ہے اگر لڑکی کو اس مرحلہ پر ضروری معلومات سے مسلح نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ اُسے بہت بڑا ضرر پہنچ جائے گا۔ پہلا حیض ایک جذباتی صدمہ ہوتا ہے چاہے اُس کے مقابلے کے لئے لڑکی تیار ہو یا نہ ہو۔ تیاری کی صورت میں لڑکی جنس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتی ہے اُس کا ابتدائی تجسس تیز ہو جاتا ہے اور وہ "ناقابل بیان" باتوں کو جاننا چاہتی ہے جنھیں کبھی صحیح ناموں سے پکارا نہیں گیا۔ عدم تیاری کی حالت میں وہ حیض کو ایک بیماری تصور کرتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

اُس کا تردد اور تشویش بڑھ جاتی ہے۔ حیض کی ابتدا سے لڑکی کا نقطۂ نظر زندگی کے متعلق سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اب تک وہ چینی مٹی اور کافور کے بچوں سے کھیلتی رہی ہے اب اُس میں منزل امومت کا شعور پیدا ہو جاتا ہے جسے فطرت نے اس کے لئے متعین کر دیا ہے۔ کافوری ننھّوں کی محبت حقیقی بچوں کی محبت سے بدل جاتی ہے اور اُن کی دیکھ بھال سے زیادہ اُسے کسی چیز میں لطف نہیں آتا۔ وہ اپنے ہی بھائی بہنوں کی نگہداشت کامل مستعدی اور جوش کے ساتھ کرنے لگ جاتی ہے۔ اس مستعدی اور جوش کی موجب مادری جبلّت ہے جو اُس میں اب بیدار ہو چکی ہے اور وہ زندگی کے متعلق ایک سنجیدہ نقطۂ نظر کی نشو و نما بھی کر رہی ہے۔ گو لڑکی جسمانی اعتبار سے بلوغ کو پہنچ گئی اور بچے جننے کی اہلیت بھی اُس میں پیدا ہو گئی مگر نفسیاتی لحاظ سے وہ سن شعور کو نہیں پہنچی۔

ہماری لڑکیاں فیشن پرستی اور اُس کی غلامی میں ایک امتیاز حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ خصوصیت غریب اور امیر سب طبقوں میں پائی جاتی ہے حتیٰ کہ دیہاتی طبقے بھی اس سے متأثر نظر آتے ہیں۔

آہستہ آہستہ لڑکی بدلتی جاتی ہے۔ اُس کے غلو میں کمی آجاتی ہے اور اہم مفاد اس کی ساری توجہ کو جذب کر لیتے ہیں۔

اب وہ ایک نوجوان خاتون بن جاتی ہے۔ چھچھوراپن غائب ہو جاتا ہے۔ اُس میں متانت کے ساتھ اپنی منزل کا شعور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ امیر زادی ہو یا مزدور کی بیٹی، اس میں یہ احساس بڑھتا ہی جاتا ہے کہ اُس کا اصلی پیشہ بیوی اور ماں بننا ہے۔ یہ متانت اُس کے سارے کردار پر مؤثر ہوتی ہے جس کا اظہار اُس کے برتاؤ میں ہوتا ہے۔ اب تک حقائق زندگی کو جاننے کے متعلق جس خواہش کی بنیاد لایعنی تجسّس پر تھی، شدید ہو جاتی ہے۔ دوسروں کا دل لُبھانے کا شوق سمٹ سمٹا کر ایک فرد تک محدود ہو جاتا ہے۔ اب وہ اُس کا دل اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے جو اُسے رفیق زندگی بنا کر اس کی مادری جبلّت کی تسکین کر سکے گا۔ وہ اب بھی اپنی سہیلیوں سے رقابت رکھتی ہے لیکن اس کی یہ رقابت اُس کے خیالات جذبات اور چال چلن میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنی طرزِ نظر فراست اور سیرت سے دوسروں کو متاثر کرنا چاہتی ہے۔

عہد وسطیٰ میں غلامی کے آلام ختم ہو جانے کے بعد نسوانیت کی تحریک کا آغاز ہوا جس کے قائدین نے "مرد سے آزادی" کے نعرے لگا کر بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ کیوں کہ ایسا نصب العین خوش قسمتی سے ناقابل تحقق ہے جنس اور کردار میں

عورت کی ذہنی زندگی اور کردار ایک ایسا مرکّب تیار ہوتا ہے جس کے عنصر صرف مرد اور عورت ہیں۔ مرد ہر حالت میں عورت پر مسلط رہتا ہے۔ میں نسوانیت کا ہرگز مخالف نہیں۔ مجھے عورت کی آزادی کا گہرا احساس ہے۔ لیکن میں اس سوقیانہ نعرے "مرد سے آزادی" کو کسی طرح مبنی بر صداقت نہیں سمجھتا۔ ہر لڑکی اور ہر عورت کی آزادی اُن پیشوں (زوجیت اور امومت) کی حدود میں ہونی چاہیے جو نسوانی فطرت، نسوانی عضویہ اور اُس کی مدافعت سے تطابق رکھتے ہیں۔ عورت ہمیشہ عورت ہی رہے گی اگرچہ کہ اُسے مرد سے نجات دلانے کی تحریکوں کا آج کل بہت زور ہے۔

زندگی کے متعلق سنجیدہ نقطۂ نظر اختیار کرنے کے بعد لڑکی چاہتی ہے کہ اپنی شادی شدہ سہیلیوں کے تجربات سے واقف ہو اگرچہ کہ سہیلیوں کے ایسے سارے بیانات محض جنسی گپ شپ ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہر لڑکی میں جوانی کی اس منزل میں ایک ناقابل بیان تحریک پائی جاتی ہے جو اُسے مردوں یا "مرد" سے نمٹنے کی ترکیبیں سیکھنے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ اس بڑھتے ہوئے احساس میں تجسس اور واضح مقصد کے اضافہ سے ذہنی اضطراب

تیز ہو جاتا ہے۔ اس کی توجیہہ جنسیات ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہ جذباتی ہنگامہ ہمیشہ سماجی اور مذہبی قیود سے بے نیاز رہا ہے۔ تربیت یافتہ اور با حیا لڑکی بھی اپنے جذبہ کو چھپانے اور اپنی مصنوعی معصومیت سے لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن سائنسدان کو یہ ہرگز بھولنا نہ چاہیئے کہ جنس کی بیداری جذباتی زندگی پر بڑی شدت کے ساتھ اثر انداز ہو جاتی ہے۔ جب جنسیت بیدار ہو جائے اور اُسے دبا دیا جائے تو اس کے نتائج نہایت سنگین ہوتے ہیں۔

جب لڑکی بیاہی جا رہی ہو تو وہ ساری ممنوعہ باتیں جن کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اب بہت جلد ایک حقیقت بن جائیں گی۔ اب زندگی کا بڑا راز اور اُس کے وجود کا منشا اُسے ایک منتخب مرد کے ذریعہ معلوم ہو جائے گا اور اُس پر ساری دنیا اپنی مہر تصدیق ثبت کر دے گی۔ اب تک وہ اندھیرے میں تھی یا کم از کم ایسا ظاہر کرتی تھی، لیکن یہ "اچھی اور مہربان دنیا" اب اُسے اجازت دے گی کہ وہ اپنے تصنع کو ختم کر دے۔ شرم و حیا کا وہ جھوٹا احساس جو لڑکی کے حقیقی احساسات کو چھپانے کے لیئے پیدا کیا گیا تھا، اس میں منافقت کا باعث بن جاتا ہے اور اکثر یہ

منافقت غیر آسودہ ازدواجی زندگی کے سانحے کی ابتدا ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ نسوانی حیا ایک مصنوعی احساس ہے، وہ مرد میں شہوانی ہیجان کی موجب بھی ہے۔

پہلے حقیقی اُنس کی بیداری اور اُس اجنبی سے پہلی آشنائی کے ساتھ ساتھ (جو اُس کے جیون ساتھی، محافظ اور اُس کے بچوں کا باپ بننے والا ہے) عورت کی ذہنی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر وہ چیز جو جنسیت کے وسیع ترین مفہوم میں جنسیت سے متعلق ہو اُسے غیر شعوری طور پر مرغوب ہوتی ہے اگرچہ کہ وہ شعوری طور پر صرف اُمومت سے تعلق رکھنے والی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہو۔

مادری جبلّت کی بیداری کے ساتھ ساتھ اُس میں ایک اچھی رفیقہ اور اچھی بیوی بننے کی تمنا بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اُن قیود سے چھٹکارا چاہتی ہے جو ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں نے اُس پر عاید کر دیئے تھے۔ اب وہ صرف اپنے شوہر کے نزدیک ذمہ دار ہے۔ اُس کا یہ احساس وحدت دو روحوں کو جنسی اختلافات کے باوجود ایک کر دے گا اور ہر فرد باہمی آسودگی کی خاطر اپنی خود غرضیوں کی قربانی پر آمادہ ہو جائے گا۔

اب نوجوان لڑکی بیاہ کے لائق ہو چکی ہے۔ وسیع تر مفہوم میں لڑکی اُس وقت بیاہ کے لائق ہوتی ہے جب کہ وہ اُس شاندار فرض کو ادا کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے جو فطرت کی طرف سے اُس پر عاید ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی کا عام مقصد ایک پسندیدہ انسان کے سنجوگ میں بچے جنتا ہے۔ لیکن نوع کو صرف باقی ہی رہنا نہیں ہے۔ اسے اپنی خوبیاں بھی قائم رکھنا ہیں ہر نوجوان عورت واضح رہے کہ وہ اپنی فطری منزل پر اسی وقت پہنچ سکتی ہے جب کہ وہ نسل انسانی کی اصلاح اور برتری پر بھی نگاہ رکھے

ہونے والے شوہر کی عادات و اطوار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا خیال، عورت کی زندگی کے تغیرات کے خوف اور خوابیدہ تجسس سے کچھ کمزور سا پڑ جاتا ہے۔ پھر یہ خوف شہوانی جذبات سے مل کر ایک ایسی صورت پیدا کر دیتا ہے جس میں جذباتی توازن باقی نہیں رہتا۔

یہ جنسی الجھن ہر عورت میں ایک نیا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے وجود سے ہمیشہ انکار کیا جاتا رہا ہے مگر وہ ہر وقت موجود رہا ہے۔ جذبہ رقابت ہر عورت میں چھپا ہوا سا رہتا ہے۔ اُسے کبھی یہ گوارا نہیں ہوتا کہ جس مرد کو وہ پہلی مرتبہ اپنا سب کچھ دیدے

وہ کسی اور کا بن جائے۔ یہ جذبہ حیاتیاتی شہادتوں کے خلاف ہے کہ سب انسان "جفت زوجی" ہیں۔ کیا رقابت محض محبت سے پیدا ہوتی ہے؟ کیا جذبہ دو خوفوں کا مرکب نہیں ہے؟ ایک خوف محبوب کو کھو دینے کا اور دوسرا یہ خوف کہ کہیں کوئی موہنی صورت محبوب میں جنسی خواہش کی موجب نہ بن جائے۔

اب ہم عورت کی ذہنی زندگی کے اُن تغیرات سے رجوع ہوتے ہیں جو شادی اور جنسی سرگرمیوں کی وجہ واقع ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد جنسی سرگرمی نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ آج کل ازدواج سے پہلے مباشرتوں کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ روایتی اخلاق اب بھی اس بدچلنی کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ کیا کوئی شخص کسی کی جنسی زندگی میں مداخلت کا حق رکھتا ہے جب کہ اس سے کسی کو کوئی ضرر نہ پہنچے؟ بدقسمتی سے جو لوگ اس سوال کا جواب "پُر زور" انداز میں دینے کی کوشش کرتے ہیں انھیں اپنی جہالت اور تعصب کی وجہ اس مسئلہ پر رائے زنی کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ بدشعاری اور آوارگی کی حوصلہ افزائی کروں۔ لیکن یہ مسئلہ آج کی متمدنہ سماج کے مدّنظر ہمارے بے لاگ غور و فکر کا محتاج ہے۔

چونکہ ازدواجی ادارے پر اس روشنی میں بحث کرنا مقصود نہ تھا اس لئے میں صرف عورت پر ازدواج کے مجموعی اثرات کو واضح کرنے پر اکتفا کرونگا۔

پہلا جنسی تجربہ جو بکارت کو ختم کر دیتا ہے، عورت کے ذہن کو بے حد متاثر کر دیتا ہے۔ خواہ وہ اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشات کی بیداری کو محسوس کرے یا نہ کرے، لیکن ہر لڑکی اس لمحے کا خوف اور تردد کے ساتھ انتظار کرتی ہے جو اُس کی محفوظ دوشیزگی کو لوٹ لیتا ہے۔ چونکہ لڑکی نے دوسری عورتوں سے مبالغہ آمیز قصے سُن لئے تھے، اس لئے اُس کی خواہش اور تجسس کے ساتھ جسمانی تکلیف کا خوف بھی ہوتا ہے۔ بلکہ خواہش اور خوف محبت اور حفظ ذات کے درمیان ایک جذباتی تنازع پیدا ہو جاتی ہے جس سے کسی طرح چھٹکارا ممکن نہیں۔

اکثر لڑکیوں کو مایوسی ہوتی ہے۔ "کیا یہی سب کچھ ہے؟" "تکلیف اور تھوڑی سی لذت!" — کیا ہماری آرزو کی یہی منزل ہے؟ اس کے باوجود لڑکیاں خوش رہتی ہیں کہ انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے محبوب کو دے دیا اور اُس نے انھیں عورت بنا دیا۔ یہ خیال ہر دُکھ اور مایوسی کو رفع کر دیتا ہے۔

جنسی خط میں تدریجی طور پر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور انجام کار عورت میں اعتماد شکر گزاری اور شوہر پرستی کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ کھو کر جسمانی اتحاد کے ذریعہ روحانی اتحاد پیدا کرلیتی ہے۔ اُس کی حیا شعاری میں تغیر واقع ہو جاتا ہے اور زندگی کے اس نئے منظر کی حسین یاد اُس کی زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔

نئی دُلہن کے لئے امور خانہ داری میں دلچسپی لینا اور اپنے شوہر کی راحتوں کا خیال رکھنا واجب نہیں ہے۔ یہ اُس کے فطری فرائض ہیں جیسا کہ بچے جننا وغیرہ۔ ان فرائض سے زیادہ اہم شوہر کی عادات و اطوار بلکہ اُس کی طرز نظر سے مطابقت پیدا کرنا ہے۔ اس کے بغیر اور ضبطِ نفس کے بغیر دو اجنبیوں کی مشترکہ زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ عورت لائق ستایش ہے کہ وہ مرد سے زیادہ توافق کی عادی ہوتی۔ اس کے لئے فراخ دلی اور فیاضی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض اوقات شوہر کی جانب سے ناروا مطالبات کئے جاتے ہیں۔ دونوں کو لین دین کی حکمت عملی پر کاربند ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ اُنھیں تاعمر مِل جُل کر رہنا اور ایک نئے خاندان کی بِنا ڈالنا ہے۔

حمل کے زمانے میں مرد ہی کی پیش قدمیاں عورت کے جذباتی توازن میں خلل پیدا کرتی رہتی ہیں۔ زندگی کے کسی دور میں عورت زمانۂ حمل کے سوا جذباتی بحران میں مبتلا نہیں ہوتی۔ رحم میں بچے کا وجود اُس میں اعلیٰ جذبات کو اُکسا دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی فرشتہ یا مقدس ہستی بن گئی ہے۔ اُس میں روحانی طمانیت اور آسودگی اس خیال سے پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حاملہ ہے اور کوئی تخلیق ہونے والی ہے۔ یہ سب چیزیں اس کے اطراف ایک ایک ہالہ کھینچ دیتے ہیں۔

اب یہ چنچل لڑکی متین بن جاتی ہے اور اُس کی یہ متانت ہر طرح لائق احترام ہوتی ہے۔ غیر مولود بچے کی محبت، مادری جبلّت کے طلوع کی خبر دیتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ جذبہ کس قدر ارفع اور اعلیٰ ہے۔ عورت کی زندگی کے دو لمحے انتہائی مسرت کے حامل ہوتے ہیں۔ پہلا لمحہ وسط حمل میں واقع ہوتا ہے جب کہ وہ بچے کی پہلی جنبش کو اپنے رحم میں محسوس کرتی ہے۔ دوسرا لمحہ وہ ہوتا ہے جب کہ وہ نومولو کی پہلی چیخ کو سنتی ہے۔

یہ سب خارجی حالات اُس خلفشار کے لئے ضروری ہیں جو عورت کے نفس میں شادی کے پہلے سال میں پیدا ہو جاتا ہے

اور جس کی بنیاد ارادی اور منظم فریب پر ہوتی ہے۔ یہ قصور لڑکی کے قریبی ماحول اور ماں کا ہے۔ لڑکی ایک طرف جنسی تسکین کی پیاسی ہوتی ہے اور دوسری طرف ماں جذبات کو چھپانے کی تلقین کرتی ہے بلکہ اُسے یہ فخر محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا داماد شبِ زفاف میں یہ تصدیق کر سکے کہ "واقعی لڑکی معصوم ہے اور کچھ نہیں جانتی" مگر یہ سب دھوکا ہے۔ ایک جُرم ہے۔ آج کل کی لڑکیاں کچھ نہ کچھ جانتی ہیں۔ حالات بدل چکے ہیں اور مرد کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ اس کی بیوی خانہ داری کی اہلیت رکھنے کے علاوہ اُس کی جنسی خواہشات میں برابر کی شریک بھی ہے۔

بعض اوقات حمل کے زمانے میں عورت اپنی صحت مند فہم عامہ اور قوت فیصلہ کھو دیتی ہے۔ وہ پُرانی بیویوں کے توہماتی قصے سُن کر اپنے تردّدات میں اضافہ کر لیتی ہے۔ اُس کی نفسیات یہ سوچتی ہے کہ آیا حمل ایک پسندیدہ چیز ہے یا ناپسندیدہ۔ پہلی صورت میں وہ خوشی سے باغ باغ ہو جاتی ہے کہ وہ پوری عورت بن کر اپنے محبوب شوہر کو بچے کا تحفہ پیش کرے گی اور اس طرح اپنے مقصد زندگی کو پُورا کر سکے گی۔ دوسری صورت میں وہ اپنی "بدقسمتی" سے اُداس اور مغمُوم ہو جاتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے

کہ دولتمند طبقوں میں غلوئے تمدن کی وجہ حمل کا خوف جاگزیں ہوگیا ہے۔

وضع حمل کے موقع پر جسمانی کرب میں نفسیاتی عناصر سے کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اکثر عورتیں دردِ زہ سے پاگل سی ہو جاتی ہیں، وہ اپنے شوہر کی صورت دیکھنا یا آواز سُننا تک پسند نہیں کرتیں۔ وہ شوہر کو اپنی تکالیف کا باعث سمجھتی ہیں مگر یہ بھول جاتی ہیں کہ بچے کی تمنا مرد سے زیادہ عورت میں ہوتی ہے۔ وہ شوہر شادی اور مباشرت سب کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتی ہے۔ دایہ عموماً یہ پامال فقرہ سُنتی رہتی کہ "اب کبھی نہیں" لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تکالیف کے رفع ہوتے ہی اس ارادے میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے کی پہلی چیخ پر ساری تکلیف نزع بھولی بسری چیز ہو جاتی ہے۔ اب عورت ماں بن چکی اور اُس کی زندگی کا آسودہ ترین زمانہ شروع ہو گیا۔ ساری توجہ جو پہلے شوہر پر صرف کی جاتی تھی اور ساری خود آرائی اور خوش نمائی کی خواہش اُس حقیر ترین مخلوق کی نگہداشت میں منتقل ہو جاتی ہے جسے اُس کی ماں سب سے زیادہ حسین اور لائق محبت سمجھتی ہے۔

عورت کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ امومتہ اس کا پہلا فرض ہے۔ فطرت کا اُس کے حق میں یہی فیصلہ ہے۔ اُس کی نجات مرد یا بچوں کی سے

آزادی میں نہیں ہے۔ اس کی نجات کا واحد ذریعہ بچہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بچے کے بغیر ازدواج اپنی نصف آسودگی کھو دیتا ہے۔ مرد و عورت کے درمیان ایک ہو جانے کا احساس اور یہ کوشش کہ وہ ایک دوسرے لئے جئیں اور مریں، صرف بچے سے متشکّور ہو سکتی ہے۔ صرف اُمومت ہی سے عورت کی ذہنی زندگی کھِل سکتی ہے چاہے وہ شادی سے پہلے کتنی ہی اچھی رہی ہو۔ اُس کے جذبات کی ساری بے اعتدالی اُمومت سے رفع ہو جاتی ہے اور اُس کی سیرت قائم ہو جاتی ہے۔ مادری محبت جنسی محبت کے مقابلہ میں بے لوث ہوتی ہے، عورت دفعتاً ایثار اور قربانی کا مجسمہ بن جاتی ہے۔ اُس کی پوری سیرت کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ جب کبھی اس کے بچّے کی فلاح، آسودگی یا زندگی خطرے میں پڑ جاتی تو وہ تقریباً فوق البشر بن جاتی ہے۔ عورت کو اپنے بچے کے بستر علالت پر دیکھو۔ مادری محبت، تحمل، قوت ارادی اور ایک عزم بالجزم کہ اُس کے بچے کی جان بچ جائے۔ اُس کی تکان اور تکلیف کو غیر محسوس بنا دیتے ہیں۔ یہ تحمل اور ایثار کاملاً نسوانی محاسن ہیں اور مرد آج تک ان کی گرد کو بھی پہنچ نہ سکا۔

لیکن آنے والے زمانوں میں اُس کا یہ کردار مستقل نہیں رہتا

اگرچہ کہ اُس کی نظر اپنے بچے کے متعلق ویسی ہی رہتی ہے۔ بہت جلد وہ اپنی خصوصیات کا اظہار شروع کر دیتی ہے۔ خود آرائی، دلفریبی کی خواہش، بناؤ سنگھار کا شوق اور فیشن کی غلامی نے تعیشات کی عجیب و غریب پیاس پیدا کر دی ہے۔ عورت، حسین، زردار، خوش پوشاک اور بے غم رہنا چاہتی ہے۔ ہر عورت اپنی خوش قسمت بہنوں سے حسد کرتی ہے اور اُس کی یہ مخصوص صفات اسے یا اُس کے محبوب کو مائل بہ جرم کر دیتے ہیں۔

بڑھاپے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُس کی خود بینی اور خود نمائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اگر وہ بدصورت ہے تو خوبصورت بننے کی کوشش کرے گی۔ بوڑھی ہے تو دوشیزہ دکھائی دینے کی سعی کرے گی۔ حتیٰ کہ سنگھار کے سارے حربے استعمال کر جائے گی عمر چھپانے کے لئے جھوٹ بولے گی اور اپنے بچوں تک سے انکار کر جائے گی۔ وہ اپنی ضائع شدہ جوانی کی خواہش کرتی ہے جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ عورتوں میں حُسن اور اقتدار کے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ مستحسن ہے اور دنیا اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے۔ کیونکہ اس کشمکش نے عورت کی بہترین صلاحیتوں کو اُجاگر کر دیا ہے۔ سیاست، قانون

اور دیگر شعبوں میں عورت کا حصّہ کافی ہے۔ دنیا مظاہر سے دھوکا کھانا چاہتی ہے اور اس واقعہ سے سب سے زیادہ فائدہ عورت اُٹھاتی ہے۔ وہ حسن ہی کو اپنا حربہ سمجھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اُسے تاعمر قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اُسے بڑھاپا کسی قیمت پر گوارا نہیں وہ اپنی ساری توانائی فیشن اور آرائش میں صرف کردیتی ہے۔

یہ صداقت ہر زمانے اور ہر طبقے پر یکساں چسپاں ہے۔

ہر عورت بڑھاپے کی آمد پر جوانی سے چمٹ جاتی ہے۔ وہ جوان ہی بلکہ دوشیزہ لڑکی بننا چاہتی ہے اور اس کوشش میں اکثر اُس کی ہیئت مضحکہ خیز ہوجاتی ہے۔ تہذیب حسن کی ساری مصنوعات بے اثر ہوجاتی ہیں۔ کوئی شخص (اور خود عورت) ان چیزوں سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ لیکن عورت کی اس نفسیات پر نکتہ چینی کرنا فضول ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی کرتی آئی ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی کرے گی۔ البتہ وہ عورت جوان رہ سکتی ہے جو زندہ دل ہو اور زندگی سے لطف اندوز ہونا جانتی ہو۔ کبھی کبھی ہمیں ایسی بوڑھی خواتین نظر آجاتی ہیں جو سفید بالوں کے باوجود نوجوان عورتوں سے زیادہ خوش مزاج اور دلفریب ہوتی ہیں۔

... کے ذریعہ اُس نے دنیا کی نظر میں ایک مقام

حاصل کرلیا ہے اور مرد اُس کی علانیہ پرستش کر رہے ہیں۔ عورت پُوجے جانے کو دل سے چاہتی ہے۔ دنیا میں کوئی عورت ایسی نہیں ہے جس کی زندگی میں مرد کا ہاتھ نہ ہو۔ گو عصرِ حاضر کی عورت مردوں کو ہمارے سیارے سے جلا وطن کر دینا چاہتی ہے لیکن اُس کا مرکز ثقل آخر میں مرد ہی ہوتا ہے۔ دیر سویر وہ کسی نہ کسی مرد کو ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ ہمیں یہ پوری آزادی سے کہنے دیجئے کہ عورت مرد کے ذریعہ اور مرد کے لئے ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ اُس کی خود آرائی اور نمائش مرد ہی کے لئے ہے۔ اسی لئے اُسے اپنی خزاں کا اندیشہ کھائے جاتا ہے۔

اُس پر مسدودی حیض کا خوف کبھی چھایا ہوا رہتا ہے۔ مسدودی حیض سے یہ مراد ہے کہ عورت جنسی خواہش کو جگانے کے قابل نہیں رہی گو یہ خواہش قطعی طور پر مُردہ نہ ہوئی ہو۔ تاہم اس کا اثر اُس کی نفسیات پر گہرا پڑتا ہے اور وہ سمجھنے لگتی ہے کہ اب وہ عورت نہیں رہی۔

وہ ہر نوجوان اور خوبصورت عورت سے حسد کرنے لگ جاتی ہے اس حادثہ کے بعد اُس کے رشک و حسد میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ کسی طرح دبایا نہیں جا سکتا بلکہ وہ ایک بیمار جذبے میں

سر اُٹھاتا ہے جسے جھوٹ کے ذریعہ فتنہ پردازی کے شوق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ میں عورت کی توہین نہیں کر رہا ہوں بلکہ اظہار حقیقت سے کام لے رہا ہوں۔ میں عورت کا احترام اُس کی کمزوریوں کے باوجود کرتا ہوں۔ عورت واقعی بداندیش ہوتی ہے۔ حُسن اور جنسی ترغیب کے فقدان سے اُس میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر انسان اقتدار کا بھُوکا ہوتا ہے اور عورت کا اقتدار اُس کے حسن میں ہے عورت بڑھاپے کے چنگل میں آچکی۔ اس نے نسوانیت کا تحفظ کیا اور وہ عورت کی مسرتوں سے لطف اندوز بھی ہوئی اور اب وہ اپنی گم گشتہ جنت کو پھر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مگر چونکہ یہ ناممکن ہے اس لئے وہ ہر موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے اقتدار کی داستان شروع کر دیتی ہے۔ فہم عامہ، منطق اور قوت فیصلہ کو کھو دینے سے اس کی شیخیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی گذری ہوئی بہار، دولت، اقتدار اور خاص طور پر جنس مخالف پر کامیابی حاصل کرنے کے قصّے موقع بے موقع چھیڑ دیتی ہے۔ وہ اس لئے جھوٹ بولتی ہے کہ ایک سنسنی پیدا ہو جائے اور جس عزت کی وہ مستحق نہیں رہی وہ عزت اُسے دوبارہ مل جائے۔ جو عورتیں اپنی فکری توانائی اور قوت فیصلہ کو آخر تک قائم رکھتی ہیں وہ شاذ ہیں

مجھے خوف ہے کہ اگر میں بوڑھی عورت کی ذہنی زندگی پر اپنے تجربے کو ذرا اور وسعت دے دوں تو ساری جنس بھنّا کر میرا منھ نوچ لے گی۔ غرضکہ بوڑھی عورت کا ذہن اُس کی صورت کی طرح مکروہ ہو جاتا ہے اور جنس لطیف کے بیان میں ایسی مکروہ چیزوں کا ذکر کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

عورت کی نفسیات پر جو کچھ اب تک کہا گیا ہے اُس کا کم و بیش اطلاق متمدن اور تعلیم یافتہ طبقوں پر ہوتا ہے۔ کیوں کہ اعلیٰ تہذیب یافتہ عورت میں واضح طور پر نسوانی کردار کی ساری خصوصیات جمع ہو جاتی ہیں۔ جاہل اور پست طبقات میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم ہر سادہ عورت میں اونچے طبقے کی خاتون کے محاسن اور عیوب یکساں نظر آتے ہیں۔

عورت ہمیشہ جسمانی اور نفسیاتی طور پر عورت ہی رہتی ہے۔ ہم اُس کی نفسیات کی تہہ تک نہیں اُتر سکتے۔

عورت کی جنسی زندگی

میں اس باب میں عورت کی جنسی زندگی پر جسمانی اور نفسیاتی اثرات کو تفصیل سے بیان کرنا نہیں چاہتا۔ جنسی آلات اور اُن کے مختلف مظاہر کا ذکر، جو عورت کی جسمانیات اور نفسیات کی نشوونما سے مطابقت پیدا کرتے رہتے ہیں، اُس کے قبل آچکا ہے۔ عورت کی جنسی زندگی میں حیا، عفّت، ابتدائی جنسی تحریک کا بلوغ، جسمانیات جنسی ہیجان اور اُس کے ردِّ عمل، اور مباشرت کی پوری تفصیل (جو متاہل آسودگی کا اہم عنصر ہے) شامل ہیں۔ شادی کے بعد

اُس کی محبت کا تعلق، جنسی تجربات میں مایوسی، جنسی سرد مہری اور مرد کے برتاؤ کے پیچھے ردِ عمل ہماری گہری توجہ کے مستحق ہیں۔ بعض غیر طبعی صورتیں جیسے جلق اور اس کے مختلف طریقوں کی تاریخ، اختناق الرحم اور مرد و بیوی کا ذہنی انتشار عورت کی جنسی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن میں ان سارے مسائل پر ایک غیر فنی مقالے میں روشنی ڈالنا نہیں چاہتا۔ میں عورت کی شہوانی زندگی پر بھی رائے زنی سے باز رہونگا اگرچہ کہ جنسی زندگی کے آرٹ میں اُس کی بڑی اہمیت ہے اور جو متاہل آسودگی کے لئے تقریباً ناگزیر بھی ہے مگر بہت کم لوگ اس راز سے واقف ہیں۔ میں صرف انھیں سرسری طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر اس چھیڑ سے قارئین کا تجسس جاگ پڑے اور وہ اس سے زیادہ سائنسی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی جنسی زندگی کی تصویر زیادہ مکمل، وقیع اور حسین ہو جائے گی۔

مختلف حسیات جو انسانی حیوان کو انعام کی گئی ہیں، عورت کی جنسی زندگی میں اہم حصہ لیتی ہیں۔ عموماً حس لمس اور اس کی حساسیت جسم کے بعض رقبوں میں جنھیں شہوانی حصوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اکثر جنسی حظ کو بڑھا دیتا ہے۔ پستان کی مالش، بوسہ بازی اور جسم کے مختلف حصوں پر مساس زمانہ قدیم سے جاری ہیں اور ان کی شہوت خیزی

مُسلّم ہے۔ حسِ لمس کے بغیر جنسی حظ کا تصور ناممکن ہے۔
فرد کی صلاحیت پر اشتعال کے درجے اور وقت کا انحصار ہے۔ جو شخص اس ہیجان کا ذمہ دار ہے وہ بھی اُس کی شدت اور دوران میں اپنی افتاد طبیعت کے لحاظ سے کمی یا بیشی کا مُوجب ہوتا ہے۔ ماں باپ کے بوسے اور محبوب کے والہانہ بوسے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مساس بہت ہی ابتدائی چیز ہے اور ایک لطیف بوسہ اس حس کو متاثر کرنے کا ترقی یافتہ طریقہ ہے۔ پھر یہ طریقہ شہوانی اور شہوت انگیز بھی ہے۔ حس لمس سے وابستہ ہزاروں نازک اعصاب ہوتے ہیں جو سب کی سب جنسیت کی خدمت میں لگا دیئے جاتے ہیں۔

شامہ اور ذائقہ:۔ محبوب کے پسینے کی بُو اور بعض عطروں کا چسکا جنسی اشتعال بھی پیدا کرتے ہیں اور جنس مقابل میں نفسیاتی نامردی اور سرد مہری کے بھی باعث ہیں۔ تمباکو کی بُو بھی عورت کو مرد سے متنفر کر دیتی ہے۔ اگر کوئی اوسط عورت تمباکو نوش منہ کو گوارا کر لے تو یہ اس کی شرافت ہے۔ مگر یہ بڑا ظلم ہو گا اگر کوئی گندہ دہن عورت سے یہ توقع رکھے کہ وہ اپنے منہ میں طبلۂ عطار گھول لیا کرے تاکہ اُس کی خوش مشامی کو ٹھیس نہ لگے۔ میں عورتوں میں تمباکو نوشی کے بڑھتے ہوئے

رجحان کی ایک وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ وہ مردوں کو ہر شعبہ زندگی میں شکست دینا چاہتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مرد کے غیر جمالیاتی برتاؤ کا انتقام لینا چاہتی ہیں۔ آج کل مجردین کی عادتیں معصوم گناہ بنی ہوئی ہیں جن میں تمباکو نوشی، شرابخواری اور قماربازی داخل ہیں، اور یہ چیزیں پہلے سے زیادہ متاہل زندگی کو ضرر پہنچا رہی ہیں۔

لوگوں کی عشقیہ زندگی میں عورت کے جسم کی فطری خوشبو ہمیشہ ایک اہم عنصر سمجھی گئی ہے۔ ایک حسّاس عاشق عموماً اپنے معشوق کا رومال، فیتہ، بالوں کی لٹ یا کوئی اور چیز حاصل کر کے ایک قسم کا حظ حاصل کرتا ہے اور محبوبہ بھی ان تحفوں کے اثر سے خوب واقف ہے اور کسی نہ کسی عنوان سے انھیں تیار کر کے پیش کرتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں عورت کے جسم کی فطری خوشبو اہم تھی اور ہمارے زمانے میں عرقِ گُل۔

حسِ شامہ سے وابستہ حسِ ذائقہ ہے جو نسبتاً غیر اہم۔ بوسہ کا ذکر اس کے پہلے آچکا ہے۔

سامعہ میں کافی شہوانی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ پرندوں کا چہچہانا، وحشی کے سنگھار کی کھڑکھڑاہٹ اور گانے کے بھی اثرات جنسی زندگی پر پڑتے ہیں۔ عورت کی گویائی اور آواز کے ترنم میں بھی

شہوت خیزی پائی جاتی ہے۔ خود موسیقی الفاظ کی مدد سے بے نیاز رہ کر مرد اور عورت پر شہوانی اثر کی موجب ہوتی ہے۔ عورت کی شہوت مرد کے مقابلے میں موسیقی سے بہت جلد مشتعل ہو جاتی ہے۔

باصرہ اب تک جن احساسات کے اثرات کو شہوانی زندگی میں بتایا گیا ہے وہ سب سے زیادہ طاقتور اور حرکی حسی عضو آنکھ کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیان مبالغہ آمیز سمجھا جائے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ آنکھ ہمیشہ اُسی کی تلاش میں رہتی ہے جسے ہم حُسن کہتے ہیں۔ ہم اپنی رومانی اور شہوانی زندگی میں بھی حسن کا نصب العین کا تحقق کرنا چاہتے ہیں۔ حُسن چند مرئی ہیجانات کا مجموعہ ہے جو بطور خود اہم ہیں مگر اُن کا نظم و ترتیب آنکھ کے ارتسامات کے ذریعہ ہمارے ذہن میں مسرت اور احترام کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور ہم اُسے حاصل کرنا بھی چاہتے ہیں۔ حُسن کا تصور از آدم تا ایں دم کچھ ہی رہا ہو، اتنی بات یقینی ہے کہ وہ ہمیشہ بدلتا رہا اور بدلتا رہے گا۔ نظر کے وسیلے ہی سے ہم جنسی زندگی میں شہوانی ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ خود نمائی جو شہوانی جنسی زندگی کا ایک مظہر ہے، حس باصرہ پر موقوف ہے۔ فیشن کی حماقتیں ناقابل بیان ہیں مگر جب تک عورتیں زندہ ہیں فیشن اور فیشن پرستی جاری رہے گی۔ پہلے پہل فیشن لباس کی

قطع و برید پر زور دیتا ہے پھر اُس کے رنگ پر۔ رنگ نہ صرف عورتوں کی شکل وصورت کو دلاویز بنا دیتا ہے بلکہ اُس کا انتخاب اس لئے بھی کیا جاتا ہے کہ وہ مردوں پر شہوت خیز اثرات مرتب کرتا ہے۔ ماقبل تاریخ زمانے سے خود آرائی کا چسکا عورتوں کا شاہی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ چہرہ ہمارے ذہن کا آئینہ دار ہے اور آنکھوں کے بغیر ہر چہرہ قالب بے جان ہے۔ کوئی جسمانیات کا ماہر یا اچھا مشاہد آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت سی چیزیں پڑھ سکتا ہے۔

عورت کے جسمانی نشوونما کے بیان میں عورت کے جسم کی لچک اور خم و پیچ کا اشارہ کیا گیا تھا جیسے چوتڑوں کا اُبھار اور چھاتیوں کی گولائی وغیرہ۔ حرکت جسم کی زندگی ہے۔ جب تک جسم حرکت نہ کرے پورا شہوانی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ جسم کی متناسب حرکت میں چہرے کا اُتار چڑھاؤ، ہنستے وقت گالوں میں گڑھا پڑ جانا، سُرخ لبوں کے درمیان سے موتیوں کی چمک، میٹھی میٹھی مسکراہٹ، تیوری کا بل اور شرمیلی آنکھوں کا جھکاؤ عورت کے من موہن ہتھیار ہیں۔ دلکش قد و قامت اور ان کا متناسب رکھ رکھاؤ بھی شہوانی مہیجات کہلاتے ہیں۔ فن رقص کی ترقی یافتہ صورتوں میں

تناسب حرکات جنسی شہوت کے سرچشمے مانے گئے ہیں۔ فطرت کے شاہ کار یعنی انسان کے ملکات کا معقول علم شہوانی ہیجانات برپا کرنے کے بجائے جمالیاتی ذوق پیدا کر سکتا ہے۔

عورت اور ازدواج

"ازدواج مرد و عورت کے درمیان رابطۂ مسلسل کا نام ہے"

ہم نے اب تک عورت پر بحیثیت فرد کے نظر ڈالی ہے اور کہیں کہیں مرد کی زندگی سے اُس کے تعلق کے متعلق اشارے کئے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک تنہا فرد کی حیثیت سے عورت پر غور کیا جائے۔ کیوں کہ وہ اپنے جوڑے کا ایک نصف ہے جس کے بغیر سلسلۂ نوع قائم نہیں رہ سکتا۔ چونکہ ساری نسل انسانی کا ماخذ ابتدائی انسان ہے، اس لئے وہ کبھی منقطع نہیں ہو سکتی جب تک مرد اور عورت باقی ہیں۔ اس جوڑے میں فطرت نے عورت کو بڑی

اہمیت دی مگر وہ اپنی عملی، جنسی اور شہوانی زندگی میں مستغنی نہیں ہے۔ اس کی سرگرمیوں کے بے شمار جالے جنس مقابل کے اطراف بُنے جاتے ہیں۔ اس مختصر مقالے میں ازدواج کے تاریخی پہلو پر دور ظلمت سے آج تک تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا دشوار ہے ازدواج کے قدیم لسالم اور اُس کے اقسام جیسے گرفتار کر کے شادی کرنا، تجارتی شادی اور مذہبی شادی وغیرہ کے متعلق دوسری جگہ حوالے دیدیئے گئے ہیں۔ موجودہ ازدواج میں دور ظلمت کی شادیوں کی چند خصوصیات کسی نہ کسی روپ میں پائی جاتی ہیں۔ گو بیاہی جانے والی عورت کی حیثیت میں عہد وسطیٰ کے مقابلے میں کافی اصلاح ہوئی ہے لیکن ہمارے پیچیدہ تمدن، معاشی حالات اور معاشری انحرافات نے اُس میں ایک نئے رنگ سے انحطاط پیدا کر دیا ہے۔ اغوائی اور تجارتی شادیوں میں صرف اتنی ترمیم ہوئی کہ اب جانبین کے احساسات کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ عورت کی خریداری محض رمزی بن گئی۔ قیمت خرید والدین کو دینے کے بجائے عروسی تحفے کے طور پر دلہن کو دی جاتی ہے اور دُلہا اپنی ہونے والی دُلہن سے خاصی رقم وصول کر لیتا ہے۔ تجارتی شادی کا اساسی عنصر ابھی قائم ہے۔ نظریہ یہ تھا چونکہ شوہر اپنی

بیوی کی تا عمر کفالت کرتا ہے اس لیئے وہ دُلہن کے سرپرستوں سے کچھ یکمشت رقم لے لیتا تھا جس کی مقدار ان کی حیثیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی۔ اس طرح جہیز کی رسم قائم ہوئی۔ چند زوجی اور چند شوہری ازدواجات سے قطع نظر جو یک زوجی ازدواج کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، موجودہ ازدواج نے تدریجاً قانونی ازدواج کی شکل اختیار کی۔ شوہر اغوا کر کے یا دام دے کر لڑکی کو اپنے قبضے میں کر لیتا تھا اور رسمی طور پر اپنی شادی کا اعلان کر دیتا تھا۔ اس طرح بیوی کی قانونی حیثیت قائم ہو جاتی اور اُسے جماعت تسلیم کر لیتی۔ بہر حال یہ نام نہاد متمدن نسل انسانی پہلے زمانے کی طرح اب بھی دُلہا دلہن کو خریدتی ہے اور اپنی گہری منافقت سے اُس قیمت کا نام جہیز رکھتی ہے۔ باہمی کشش محبت، جسمانی اور ذہنی موزونیت اور صحت بالکل نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ "بد قسمتی سے ان بکے ہوئے اور خریدے ہوئے افراد کے درمیان اکثر محبت کے بجائے ناموزونیت پیدا ہو جاتی ہے اور بیوی جو شوہر سے زیادہ ایک گہرے اور تشفی بخش جذبے کی خواہش مند ہوتی ہے، زنا کاری میں اُن مسرتوں کو تلاش کرتی ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ بہت سی شادیاں کاروباری

نیت سے انجام پاتی ہیں یا ان کا مقصد بچوں کو قانونی حیثیت دینا ہوتا ہے۔" یہ الفاظ موجودہ ازدواج کے حقائق کو اس قدر ایمانداری اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں کہ متمدن اور صاحب اخلاق افراد کو شرم سے اپنا سر جھکا لینا چاہیئے۔

محبت، کشش اور اُنس پس منظر میں ڈال دیئے جاتے ہیں مثالی محبت، معاشی ازدواج اور معقول ازدواج کے بہ نسبت نایاب ہے، اگر دو مفلس محبوب حقیقی کشش سے مجبور ہو کر بغیر کسی مادّی غرض کے آپس میں رشتہ ازدواج قائم کر لیں تو، ہم برہم ہو کر چیخ اُٹھتے ہیں کہ وہ بیوقوف ہو گئے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "جس دروازے سے افلاس داخل ہوتا ہے اُسی دروازے سے محبت باہر نکل جاتی ہے"! دنیا کچھ ہی خیال کرے مگر میں اس پرانی مثل کا قائل ہوں "محبت جھونپڑی میں پائی جاتی ہے"۔ مقدس انسانی جذبات کی تحقیر، موجودہ سماج کا سب سے بڑا جُرم ہے۔

عورت، محبت، جنسیت۔ یہ تین تصورات ایک دوسرے سے الگ نہیں کیئے جا سکتے۔ ہر تصور دوسرے تصور کے بغیر مہمل ہے۔ آدم اور حوّا کے زمانے سے آج تک ان ہی تصورات کا دور دورہ رہا ہے۔

بادل کا ایک ٹکڑا زمین سے اُٹھا اور اُس نے ساری زمین کو سیراب کر دیا۔ خداوند نے مٹی سے آدم کی صورت بنائی اور اُس میں رُوح پھونک دی۔ آدم ایک زندہ روح نظر آنے لگا خداوند نے فرمایا۔ یہ پورا انسان نہیں ہے۔ پھر خداوند نے اُس کی پسلیوں میں ایک پسلی لے لی اور اس کی جا بجائی گوشت سے کر دی۔ خداوند اُس پسلی سے عورت پیدا کی اور آدم نے اسے دیکھ کر کہا۔ "اب یہ میری ہڈی ہے۔ میرا گوشت ہے! اسے عورت کے نام سے پکارا جائے گا کیوں کہ وہ مرد کے گوشت پوست سے گھڑی گئی ہے۔"

یہ پہلا افسانۂ محبت ہے۔ اس کے بعد لاکھوں افسانے لکھے گئے اور اُن میں انسانوں کے دل دھڑکتے رہے۔ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی محبت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ اگرچہ مذہبی دیوانوں نے اس کا گلا گھونٹ دینا چاہا اور اُسے جہنم کی آگ میں جلا کر بھسم کر دینے کی کوشش کی۔ اگرچہ سماج نے اپنی اغراض کے تحت عریاں حقیقتوں پر ثقاہت کے غلاف چڑھا دیئے ہیں، لیکن محبت، محبت ہی رہی۔ ہم آگ کو بجھا سکتے ہیں مگر اُسے ٹھنڈی آگ میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ جہاں محبت کا راج ہے،

وہاں ساری رکاوٹیں اور تمدن کے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ اس کی انتہا، ابتدا کی طرح ایک ہے ..... آدم اور حوّا۔

جب ہم متمدن لوگ چند زوجی اور چند شوہری شادیوں پر تنقید کرتے ہیں اور اپنے آپ کو یک زوجیت کا وکیل گردانتے ہیں تو مرد و عورت میں ایک امتیاز پیدا کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یک زوجیت عورت کے لئے لازمی ہے، مرد کے لئے نہیں۔ اس دعوے کو بے ہودہ دلائل سے مدلل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا ردّ عمل طبقہ نسواں میں شدید ہوتا جاتا رہا ہے اور آزاد بد چلنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اوسط مرد و عورت، اپنی جنسی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں اور یہ خواہشات کسی ایک فرد تک محدود نہیں ہوتیں۔ دیر سویر، علانیہ یا خفیہ مرد و عورت اپنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ یک زوجیت اُسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب کہ دو افراد وفاداری کی خاطر ایک دوسرے کے وفادار رہیں نہ کہ اخلاقیات یا رائے عامہ سے ڈر کر۔ یہ سچ ہے کہ بعض افراد ایسے ضرور پائے جاتے ہیں اور اُنھیں پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ "محبت جھونپڑی میں پھلتی ہے"۔ ان کے لئے یک زوجیت فطری اور آزاد ہوتی ہے۔ روایات اور رائے عامہ کی زبانی ہمدردی، ملکی قوانین اور بعض مذاہب کے قوانین کیسے بڑے

استعمال ازدواجی بے وفائی اور منافقت کا رونا روتے ہیں اور موجودہ زندگی کی بڑھتی ہوئی اخلاقیات کے خاص طور پر ذمّے دار ہیں۔

اگر ہم شادی کی مروجہ صورتیں بیان کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم موجودہ ازدواج میں اخلاق اور محبت کا شائبہ تک نہیں پاتے۔ گو ہم وحشیوں سے بہت آگے نکل آئے ہیں اور ہمیں اپنی تہذیب پر ناز بھی ہے مگر تجارتی شادی کے سارے عناصر ہماری سماج میں ابتک موجود ہیں۔ یہ ہماری "واقعیت پسندی" کا نتیجہ ہے کہ ہم شادیوں میں کردار اور ذمہ داری کے بجائے نام ونمود اور زر وسیم پر جان دیتے ہیں۔ بدصورت لڑکیوں کے ماں باپ بَر حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے ہیں اور خوب صورت لڑکیوں کے امیر والدین عظیم المرتبت دامادوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اُن کی صحت، کردار یا گذشتہ سوانح سے واقف ہونے کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ چیزیں آئندہ آسودگی کے لئے نہایت اہم ہوتی ہیں اگر آسودگی منشائے ازدواج ہے۔ لڑکی کے احساسات کا اندازہ نہیں کیا جاتا۔ بَر کا انتخاب لڑکی کے بجائے والدین کرتے ہیں۔ ان کے عواقب اتنے ظاہر اور مشہور ہیں کہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر اُس لڑکی یا بدچلن لڑکی کو لیجیے، جو

شادی کے جوّے میں ایک پیر فرتوت مگر مالدار کے ساتھ جوتی جارہی ہو۔ لڑکی کی ساری جوان آرزوئیں والدین کی "فہم عامہ" پر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں جو اُسے معاشی حفاظت اور اُس متروکہ دولت کا یقین دلاتے ہیں جو اُسے شوہر کے انتقال کے بعد حاصل ہوگی۔ ایسی شادیاں اتنی ذلیل اور ایسے ماں باپ اتنے پاپی ہوتے کہ اُن کا قانون کے ذریعہ انسداد ضروری ہے۔ اس بدنصیب نوجوان لڑکی سے جو ایک صحتور جنسی تحریک کی تشفی کے لئے بے چین ہو، یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ فحاشی، دغابازی اور بیہودگی کی طرف مائل ہو جائے گی۔ اگر اُس کے ماں باپ کی "فہم عامہ" صحیح ہوتی تو اُسے بھی زندگی اُبھرنے اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع ملتا۔

شادی کی ان تمام شکلوں کے برعکس محبتی جوڑے بھی ہیں جن کا عموماً مذاق اُڑایا جاتا ہے بلکہ اُن کا وجود ہی مشتبہ ہے وہ بعض اوقات محبت کے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں اور بدنام ہو جاتے ہیں۔ وہ شادیاں جن میں محبت صرف جنسی خواہش کا نام ہو، ہر طرح لائقِ ملامت ہیں۔ یہ نام نہاد محبت اپنی تسکین کے بعد مرجھا جاتی ہے اور مرد و عورت کی روح کو ایک دوسرے کے سامنے ننگی کر کے

پیش کردیتی ہے۔ لیکن محبت اور جنسی خواہش دو مختلف چیزیں ہیں۔ محبت ایک جذبہ نہیں ہے۔ وہ کئی جذبات کا مرکب ہے جن کا اظہار احساس وحدت میں ہوتا ہے۔ جس شادی کی بنیاد اس محبت پر ہو وہ اس بات کی ضامن ہے کہ جانبین کو باہمی وفاداری قائم رکھنے کے لیئے خارجی اوامر و نواہی کی ضرورت نہ ہوگی۔ خود احساس وحدت سے ضبط نفس پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمیں خیال ہوتا ہوگا کہ تعلیم کی عام اشاعت اور عالمی تحریک نسواں کے اثرات کی وجہ سے عورتیں یہ جان چکی ہوں گی کہ ازدواج لازمی طور پر پھولوں کی سیج نہیں ہے جیسا کہ ہمارا روایتی علم اُسے بتاتا ہے۔ مختلف لوگ لازمی طور پر ازدواج کے بارے میں مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب کا اس پر اجماع ہے کہ عورتیں شادی کے لیئے مرتی ہیں اور وہ ماں بننے ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ بعض عورتیں یک زوجیت کو پسند کرتی ہیں۔ بعض رجائی، بعض قنوطی، بعض بدصورت اور نیک سیرت، بعض حسین اور بدسیرت ہوتی ہیں۔ بعض کھانا پکانا جانتی ہیں بعض نہیں جانتیں، بعض لائق محبت اور بعض ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ بعض ذہین اور بعض بے وقوف۔ بعض اکتا دینے والی اور بعض دلچسپ مگر ایک خصوصیت سب میں مشترک ہوتی ہے کہ وہ

سب متاہل ہونا چاہتی ہیں۔ بیاہی جانے والی عورت کو اچھی منتظم بیوی سے زیادہ بھی کچھ ہونا ہے۔ وہ اب لونڈی نہیں رہی ہے۔ گذشتہ صدی میں اس کی حیثیت بالکل بدل چکی ہے۔ مگر بنیاد ویسی ہی قائم ہے کہ عورت گھر کی رانی ہے۔ اگر شادی محبت کا نتیجہ ہے اور عورت اپنے شوہر کی دلچسپیوں میں برابر کی شریک رہنا چاہتی تو کوئی وجہ نہیں کہ شوہر اپنی مجرد زندگی کی عادات اور "معصوم گناہوں" جیسے جوا، شراب خواری، تمباکو نوشی وغیرہ پر قابو حاصل کرکے ایک آسودہ متاہل زندگی کی بنیاد نہ ڈال سکے۔ ذرا سی غفلت اور غلط فہمی سے بیوی اپنے شوہر کی چند زوجی رجحان کو برانگیختہ کر دیتی ہے اور وہ گھر چھوڑ کر باہر کی دلچسپیوں میں پڑ جاتا ہے۔ محض دوستی بیوی کی اصلی حیثیت کی ضامن ہے اور ایسی دوستی ہزار گنا نوازی جاتی ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سی صابر عورتیں بے وقوف بنائی جاتی ہیں اور ان کے شوہر انھیں طرح طرح کے دھوکے دیتے رہتے ہیں۔ بعض بیویاں شوہروں کے لئے جہنم بن جاتی ہیں۔ بہر حال جو فرق آسودہ اور غیر آسودہ شادیوں میں ہے وہی فرق زنِ بد اور زنِ نیک میں ہے۔ یہ بحث تشنہ رہے گی اگر بیاہے جانے والے شوہروں کے

متعلق کچھ بیان نہ کیا جائے۔ عورت کی آسودگی اور غیر آسودگی کا اندازہ شوہر کے رویئے سے ہو سکتا ہے۔ تسلیم و رضا کی حکمت عملی پر چلنے کے یہ معنی ہیں کہ فریقِ مقابل کی خواہشات کا احترام کیا جائے جیسے بیوی کا یہ فرض ہے کہ وہ ہمیشہ بنی سنوری رہے تاکہ اس کے حسن کا جادو شوہر کی توجہ کو بھٹکنے نہ دے اور وہ اس کا ویسا ہی گرویدہ رہے جیسا کہ وہ شادی کے ابتدائی اور سنسنی خیز دور میں تھا۔

زناشوئی تعلقات کے یہ چند ضابطے محض اضافی ہیں۔ کردار کا اختلاف شادی سے قبل اور شادی کے بعد کے حالات اور خصوصاً شادی کے ابتدائی مہینوں کے شدید تغیرات ایسے سنجیدہ مسائل ہیں کہ میاں بیوی کی باہمی نیک دلی کے بغیر اُن کا حل ممکن نہیں۔ اگر وہ ایسی چٹانوں کے مقابل کھڑے ہوئے ہوں جن سے ٹکرا کر بہت سی شادیاں پاش پاش ہو گئیں تو اُنھیں باہمی اعتماد، باہمی احترام اور باہمی محبت کی رہنمائی میں ان خطرات سے بچ نکلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر ابتدا ہی سے باہمی اعتماد کا فقدان ہے تو تباہی موت کی طرح یقینی ہے۔ ہم روزانہ ایسی مثالیں دیکھتے رہتے ہیں قومی اور مذہبی اختلاف رکھنے والے افراد کے درمیان

شادی کے مخالف صرف تمدن یافتہ لوگ ہی نہیں ہیں بلکہ وحشیوں کے بہت رسوم شاہد ہیں کہ وہ ایسی شادیوں کے خطرات سے واقف تھے اور انھوں نے مختلف طریقوں سے ان کے انسداد کی کوشش کی تھی۔ پھر ہمارا فطری عقیدہ بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے کہ خونی رشتوں کے اتحاد میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ مذہبی اور قومی تعصبات ذرا سی چھیڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مذاہب یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ کم از کم کاغذ کی حد تک میاں بیوی کا مذہبی اشتراک ضروری ہے۔ لیکن اس سمجھوتے پر جس اُمید کی بنیاد رکھی جاتی ہے وہ کبھی پوری نہیں ہوئی اور اُس وقت تک پوری نہیں ہوگی جب تک مذہبی اور قومی منافرت کا چرچا رہوتا رہے گا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں متعصب اور مذہبی جنون رکھنے والے سائنس دانوں نے مطالبہ کیا تھا کہ شادیاں خونی رشتوں اور مختلف العقائد افراد کے درمیان ممنوع قرار دی جائیں۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے انسان حقیقتاً حیوانی انواع کی خصوصیات کا حامل ہے مذہبی عقیدہ ایک اکتسابی چیز ہے جو ماں باپ یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی اکتسابی خصوصیات ان فطری خصوصیات سے

لازماً مختلف ہوتی ہیں جو جرثومی خلیوں کے ذریعہ وراثتاً حاصل ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تعلیم و تربیت سے یہ اکتسابی کردار کچھ بدل جاتا ہے جو فرد کی اصلیت سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ لیکن یہ تغیر عقل اور ارادے کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر مذاہب اور اقوام کے درمیان ساری نزاعات ختم ہو جائیں تو توقع ہے کہ ایسی شادی کی مخالفت بھی کم ہو جائے گی جو مختلف العقائد افراد کے درمیان ہوتی ہے

اس سوال کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ پہلے ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس معاملہ میں لوگ کس طرح خارجی اقتدار کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ جنسی تعلق کی ابتدائی صورت محض آزاد جنسی فعل تھی جس سے حیوانی جذبے کو تسکین مقصود تھی۔ اخلاقی ضابطوں اور بچوں کی ذمہ داریوں کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ اخلاقی قانون کا نفاذ بہت بعد کی بات ہے۔ باپ خاندان کا بانی اور محافظ ہونے کی حیثیت سے اس کا سردار بن گیا۔ گو یہ حقوق رسم و رواج کے سہارے کھڑے تھے مگر انھیں اس عقیدے سے خوراک مل رہی تھی جو کسی بالاتر قوت سے متعلق پایا جاتا تھا۔ قدیم انسانوں کے

عقائد کے مطابق ایک خاص خدا اور ایک پلید روح زندگی کی ہر سرگرمی کے لئے مقرر ہے۔ ازدواج کے لئے بھی ایک خدا مقرر ہے اس طرح ازدواج پر مذہب کا اثر پڑنے لگا۔

ہر مذہب ازدواج کے معاملات میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ جوں جوں تمدن بڑھتا گیا مذہب کا اثر ازدواج پر گہرا ہوتا گیا۔ اس کے دو اہم مقاصد تھے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ اخلاق کا عام معیار بلند ہو جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ازدواج پر تقدس کا رنگ چڑھ جائے۔ اس کے باوجود بعض مذاہب نے طلاق کو جائز قرار دیا۔ بعض مذاہب دوسرے مذاہب کے بہ نسبت اس معاملہ میں زیادہ نرم واقع ہوئے تھے۔ چونکہ ازدواج اور طلاق کی آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا احتمال تھا۔ بچوں کی نگہداشت کے لئے واضح قواعد مرتب کئے گئے اور فریقین کو نکاح ثانی کی اجازت دی گئی۔ اس کی سب سے اچھی مثال اسلام ہے۔ رومن کیتھولک عیسائی اور ہندو شادی کو خدائی بندھن سمجھتے ہیں اور اس کی عدم تحلیل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایسی شادی کی تحلیل کسی ایک فریق کی موت سے ہو سکتی ہے چونکہ یہ مطالبہ معقول نہ تھا اس لئے ان مذاہب کا نقطۂ نظر اب بدلتا جا رہا ہے۔ ازدواجی کامیابی کے لئے

ضروری ہے کہ شادی کی بنیاد باہمی کشش اور مکمل اعتماد پر رکھی جائے اور مذہبی اور ملکی قوانین (جو فریقین پر عائد کئے جاتے ہیں) مرد و عورت کو زیادہ سے زیادہ شخصی آزادی عطا کریں۔ ہر معقولیت پسند اور غیر جانب دار اس مطالبے کی تائید کرے گا۔ لیکن ابتدا ہی سے اس آزادی کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ بہت کم باعزت لوگ اس جبر کو برداشت کر سکتے ہیں جو رضا کارانہ اتحاد کو جبری اتحاد میں منتقل کر دے۔ یہ فطری بات ہے کہ اس جبر و تعدی کی فضا میں محبت کے نام لیوا سرد ہو جائیں گے اور اس کی اصلی فطرت غائب ہو جائے گی محبت کو اندرونی تحریک سے اُبلنا چاہئے۔ محبت کو مجبور نہیں کیا جا سکتا یہ جبر ساری انسانیت کو غلامی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شادی ایک قسم کی سزائے قید ہے جو مرنے تک قائم رہتی ہے۔ یہ ناانصافی مجرمانہ ہے کیونکہ یہ شریف سے شریف کردار کو دغا اور جھوٹ پر آمادہ کر دیتی ہے۔ وہ شادی جو خدا کا نام لے کر سماج کے سامنے رچائی گئی تھی، اُن دو افراد کی جبری رقابت بن جاتی جن کی راہیں اور منزلیں مختلف ہیں۔ یہ اخلاق اور ایمانداری کا دیوالیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہایت کمینہ احساسات کی پیٹھ ٹھوکی جا رہی ہے تاکہ اُس فرد کے لئے نفرت اور حقارت پیدا ہو جس کے ساتھ

دوسرے کو اپنی ساری زندگی بسر کرنی ہے اور مقدس ازدواج کی شرائط سے ایسا کرنے پر مجبور بھی ہے۔ اس کا سماج کی روایات سے منافقانہ طور پر چمٹے رہنا اور بعض مذاہب کے احکام کی لچک کو نظرانداز کردینا نسل انسانی کے لئے سخت ترین آلام کا موجب ہے۔ اس کے عواقب ان عواقب سے مختلف ہیں جن کا تصور سماج کی منافقت کرتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ بے شادی رفاقت کا ادارہ عہد قدیم سے قائم تھا۔ اسے قانونی جواز بھی حاصل تھا۔ اُسے بعض مذاہب نے کچل ڈالا مگر اُس کی باقیات سے ہماری موجودہ سماج انکار نہیں کرسکتی۔ آج اس بے شادی رفاقت سے مراد وہ زائد تعلقات ہیں جو غیر آسودہ شادیوں کے نتائج ہیں۔ اگر ناموزونیت مایوسی اور نفرت بڑھنے لگیں تو اخلاق اور فہم عامہ کا تقاضہ یہ ہے کہ فطری اور (اس لئے) غیر اخلاقی اتحاد ختم ہوجانا چاہیئے۔

چند الفاظ اُن زناشوئی تعلقات کے بارے میں بھی عرض کروں گا جہاں ازدواجی بندھن آسودگی کے ساتھ کئی سال تک قائم رہا۔ یہ کھلی بات ہے کہ بچے جنسی اتحاد میں کافی اثرانداز ہوتے ہیں۔ بچہ شوہر اور بیوی میں ایک کڑی ہے ... اُن کی محبت کی

ایک زندہ شہادت .... نسلِ انسانی کے اعادۂ شباب اور دوام کا نشان۔ لیکن چونکہ بچہ جنسی فعل کے ذریعہ علام سے وجود میں آیا اس لئے ہم جنس کی طرف پلٹتے ہیں جو آسودہ ازدواج کی بنیاد ہے۔ یہاں ایک سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا جنسی کشش غائب ہو جائے تو ازدواج کے بندھن ٹوٹ جانے چاہئیں؟ یہ سوال ناواجب ہے اگر ہم محبت کی تعریف پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ شادی کی اساس بنی ہوئی ہے۔ جب جذبات کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں تو اُنھیں کوئی رقیق سے رقیق التجا بجھا نہیں سکتی۔ ابتدا میں جذبہ پہلے اور دوستی بعد میں ہوتی تھی۔ اب یہ ترتیب اُلٹ جاتی ہے۔ جنسی خواہش میں انحطاط سے محبت میں کمی واقع نہیں ہوتی یہ محبت کو پُرسکون بنا کر حسین ترین دوستی میں منتقل کر دیتا ہے۔ موت اور محبت ایک دوسرے سے قریبی ربط رکھتے ہیں۔ محبت ایک خواہش ہے کہ مر جائیں، تحلیل ہو جائیں، کھو جائیں۔ محبت کا انعام ایک خوبصورت موت ہے.... نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے مٹ جانا!

اب ہمیں ازدواج کی منافقتوں اور دروغ بافیوں پر وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے۔ ہمارا کام یہ بتانا ہے کہ عورت کیا ہے اور

اُس سے حالتِ زوجیت میں کیا ہونا چاہیئے آسودہ ازدواج کی حد تک توجہ محدود رکھنے کے بعد ایک صورت قابلِ غور یہ ہے کہ جب شوہر چند یتیم بچوں کو چھوڑ کر مر جائے تو بیوہ کی حیثیت کیا ہوتی ہے

کلاسی ادب میں بیوہ کی حیثیت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیوہ سے نفرت کی جاتی تھی اگر اس کا شوہر بہادر کی موت نہ مرتا۔ اسی طرح اُس کی عزت کی جاتی تھی اگر وہ سورما کی موت مرتا۔ بیوہ کی حیثیت، اپنے زمانے، نسل، تمدن، تعلیم اور مروجہ اخلاقی و مذہبی تصورات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ بعض قدیم قبائل میں متوفی شوہر کے رشتے دار بیوہ کو قتل کر دیتے تھے۔ ستی کی رسم بہت سے توہمات اور عقائد کا نتیجہ تھی۔

گو ہم اس مذہبی جنون سے اپنے آپ کو بالاتر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہم میں بھی بیوگی کا ہوّا موجود ہے۔ تاہم عورت کی جنسی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انجامِ کار جیت جنس ہی کی ہوگی ۔ مضبوط سے مضبوط کردار کی عورت بھی دوسرے کے آغوش میں جا کر اپنے کردار، بچوں کے حقوق اور محبوب شوہر کے بوس و کنار تک بھول جاتی ہے۔

تن آسان عورتیں بہت سی ہوتی ہیں۔ مگر ان میں چند مستثنیات بھی ہیں۔ بعض عورتیں محض بچوں اور مرحوم شوہر کی یاد کی خاطر زندہ رہتی ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ تج دیتی ہیں۔ شوہر کی موت کے ساتھ ہی اُن کا سارا عیش و نشاط ختم ہو جاتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ایسی عورتیں لائق ستائش ہیں اور "طبی" زاویۂ نگاہ سے وہ عورتیں زیادہ طبعی ہیں جو بیوگی کو سنیاس نہیں سمجھتیں۔ کیوں کہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ سرگرم جنسی زندگی کے بعد جنسی سنیاس عورت کی صحت کو بری طرح متاثر کر دیتا ہے۔

میں ازدواج کی مسرتوں اور آلام پر کافی بحث کر چکا ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جذباتی چمک دمک سے ہٹ کر واقعات کو اصلی رنگ میں پیش کروں۔ میں نے صرف ایک سادہ حقیقت کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اب مجھے یہ بتانا ہے کہ آسودہ ازدواج کے دو بنیادی پتھروں کے علاوہ ایک تیسرا پتھر بھی ہے۔۔۔ یعنی ایک حد تک فریقین کی فکر و عمل کی آزادی۔ یہ آزادی حقیقی ہے اور وہ نہیں ہے جو تحریک نسواں کے علم پر لکھی ہوئی ہے۔۔۔۔ "مرد سے آزادی"۔ اس آزادی کے خطرناک نتائج کے متعلق ہمارے پاس قوی شہادتیں موجود ہیں

وہ انسانیت اور نسوانیت دونوں کے لئے مضر ہے۔ موجودہ تحریکِ نسواں سے امریکہ میں جو خطرے پیدا ہو چکے ہیں، اُن سے امریکہ جیسے مہذب ملک کا غفلت برتنا تعجب خیز ہے۔ وہاں اس "گڑیا" کو ایک آزاد مخلوق بنانے کے لئے امکانی کوشش کی گئی ہے۔ اس بچاری کو اپنی کمائی آپ پیدا کرنے کے لائق بتایا گیا۔ وہ تاجر، وکیل، پروفیسر جج سبھی کچھ بن رہی ہے اور یہ اعلان کر چکی ہے کہ "میں، میں ہوں" چونکہ اُسے عورت سے مرد میں تبدیل کرنے کے لئے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے گئے، اس لئے وہ معاملاتِ محبت میں ایسی روش کا اظہار کر رہی ہے گویا کہ وہ حقیقت میں مرد ہے۔ امریکی عورتیں شادی کرنا نہیں چاہتیں اور غالباً وہ کر بھی نہیں سکتیں۔ وہ مردانہ پیشوں میں کچھ ایسی گم ہوئی کہ اُس کی نسوانی فطرت ہی بدل گئی اور اب وہ ایک تیسری جنس کہلاتی ہے۔ ان امریکی نجات یافتہ عورتوں میں برابر شرح ازدواج المناک طور پر گھٹتی جا رہی ہے شرح پیدائش اس قدر گر گئی ہے کہ اہل ملک کو نا آبادی کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے۔ ان واقعات کے مدِّنظر کہا جا سکتا ہے کہ لفظ "آزادی" کی تعبیریں کتنی غلط ہوتی ہیں "مرد سے آزادی" کے معنی "نسوانیت سے آزادی" کے ہیں۔ یہ تصور عورت میں

"عورت" کا قاتل ہے اور ایسا ہر گز نہ ہونا چاہیئے۔

مجھے اُمید ہے کہ ہم ان ترقی یافتہ اقوام اور ممالک کے تجربات سے فائدہ اُٹھا کر اس "عورت" کے معمّے کو حل کر سکیں گے۔ ان عواقب کے پیش نظر تقلید خودکشی ہے۔

"اے بیٹی! محبت کے امرت اور زہر دونوں کو تو چکھ سکے گی تدبر سے کام لے تاکہ تجھ پر اپنی تخلیق کا منشا اور معنی روشن ہو جائیں۔"

موجودہ ازدواج سے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے سربرآوردہ مذاہب میں شادیوں کے رسم و رواج پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ شادیوں سے متعلق ایک عام تصور قائم کرنے کے بعد ہی اس دنیا کے کسی خاطر طریقہ ازدواج کے محاسن کو پرکھا جا سکتا ہے جہاں نوع پیچیدہ راستوں سے گذرتی آئی ہے۔

بُدھی شادیاں

جن مذاہب نے خراج عقیدت حاصل کیا اور نوع انسانی کی مایوسیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی، اُن میں سے بُدھ مت صدیوں تک اپنے لاکھوں پیروؤں کی رہبری کرتا رہا ہے۔ دینیات میں مابعد الطبیعات کا سمو دینا محض اسی مت کا کام تھا۔ وہ ایک ایسی اعلیٰ اخلاقیات کا حامل ہے جس کا ہمیشہ احترام کیا جائے گا

اگرچہ کہ روشن خیال انانیت تنازع للبقا میں اُسے رد کردے۔
چونکہ بدھ مت کبھی منقولی اور مُلّائی نہیں رہا اس لئے اُس نے ازدواج سے متعلق کوئی ضابطے اور قوانین بھی مرتب نہیں کئے۔ گو اُس کی تعلیمات نے بالواسطہ طور پر ازدواج کے عمل اور طریقہ کار پر اپنا اثر ڈالا ہے اور اُس کے اصول اور روح مساوات اس میں جذب ہو گئے ہیں۔ اُس کی روح دور و نزدیک کے ممالک میں بجلی کی طرح سرایت کر چکی تھی جہاں کے سرکاری ضابطے اور رواجی پابندیاں دوسرے ذرائع سے خوراک حاصل کرتے تھے۔ اس کا اثر شنتوئیت کے باوجود جاپان کے ازدواجی قانون اور رسم و رواج اور کنفیوشیا نزم اور قدیم روح پرستی کے باوجود چین کے قوانین میں خاصا نمایاں ہے۔
بدھی ممالک جن کی مجموعی آبادی ۳۲۵۰۰۰۰۰۰ ہے، ہماری آباد دنیا کی سب سے زیادہ مختلف المذاہب حصے ہیں۔ ان ممالک میں شادی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک غیر مذہبی معاہدہ ہے۔ کیوں کہ بُدھ راہب جو کسی قدر کلیسائی راہبوں سے ملتے جُلتے ہیں، ان شادیوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ وہ انھیں دنیوی چیزیں سمجھتے ہیں۔ ازدواجی تعلق زن و شوہر کی

یکجائی اور مطلوبہ شہرت پر موقوف ہے یعنی جوڑے کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور کھانا پینا شادی کا خاص واقعہ اور اُس کی شہادت بن جاتا ہے۔ اگر دُلہا دُلہن نابالغ ہوں تو والدین یا سرپرستوں کی رضامندی لازمی ہوتی ہے۔ اور چین کی کوئی شادی متعلقہ فریقین کی رضامندی کے بغیر انجام نہیں پا سکتی۔ چین میں خاندان کے سرداروں کا اقتدار بڑھا ہوا ہے اور وہ فریقین کی جانب سے ایک تحریری معاہدے کے ذریعہ شادی کی توثیق کرتے ہیں۔ جاپان کے نئے ضابطوں کی رُو سے (جو مغرب کی تقلید کا نتیجہ ہیں) شادی کا اعلان کسی سرکاری عہدہ دار کے سامنے ضروری ہے تاکہ اس ثبوت سے آئندہ نزاع اور قانونی چارہ جوئی میں مدد ملے۔ شادی کا تصور بحیثیت آزاد غیر مذہبی معاہدہ کے سیام کے قانون میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس قانون کی رُو سے شادی مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس پر دوسرے معاہدوں کے معمولی اصول کا اطلاق ہو سکے گا اور وہ اس وقت نافذ العمل ہو جائے گا جب کہ واضح طور پر رسوم اور ایجاب و قبول کے ذریعہ ظاہر ہو جائے کہ فریقین ایک دوسرے کو شوہر اور بیوی سمجھنے کے لئے تیار اور رضامند ہیں

بشرطیکہ مرد یا عورت میں کوئی خاص نقص نہ پایا جائے۔ ان بدھی ممالک میں یک زوجیت کی اجازت ہے۔ چین میں بے شادی رفاقت کا بھی دستور پایا جاتا ہے۔ سیام میں ایک ہی خاص بیوی ہوتی ہے اور دوسری بیویوں کی حیثیت کا تعین قانون کرتا ہے۔ ان قوانین اور اُن کی دفعات کی پابندی سے بچے جائز قرار دیئے جاتے ہیں۔ چین میں قانون بچوں کے حق میں بہت زیادہ رعایتیں کرتا ہے۔ اگر منکوحہ بیوی کے ساتھ کوئی بچہ بھی آئے تو وہ نئے شوہر کی جائز اولاد متصور ہوتی ہے۔

گو چند زوجیت کی اجازت ہے مگر چین کے سوا ہر ملک میں (برما، سیام اور جاپان) وہ تقریباً معدوم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برما اور سیام میں بیویوں کا اقتدار بہت بڑھا ہوا ہے اور دوسری بیوی پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ برما اور سیام میں بیوی کے وسیع اختیارات کا مظاہرہ روزانہ زندگی کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ہوتا ہے۔ وہ عموماً اپنی روٹی آپ کماتی ہے اور ایک مساوی حصہ دار کی حیثیت سے، قانونی حادثات میں شریک رہتی ہے۔ شوہر پر یہ فرض ہے کہ اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرے مگر جو اختیار اُسے گھر اور

اثاث البیت پر دیا گیا ہے وہ بیوی کے مشورے کے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا جاپان میں فریق ثالث کے فرائض سے متعلق تفصیلی دستور موجود ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی شادی قانونی ہوتی ہے اور بہت زیادہ غیر مساوی رفاقت نہیں ہوتی بلکہ وہ کم وبیش باہمی تلطف اور اعتماد پر مبنی ہوتی ہے اس کے علاوہ چونکہ ازدواجی تعلق معاہداتی اور قانونی ہوتا ہے اس لئے وہ ملکی روایات کا بھی لحاظ رکھتے جو عسکری عظمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ شوہر حسب ضرورت گھر کا مختارِ مطلق بن جاتا ہے اور معاہدے کے اختتام تک بیوی اُس کا احترام کرتی ہے اور اپنے آپ کو شوہر کی نیاز مند سمجھتی ہے۔ صرف چین میں بُدھی روح، عورت کو فرسودہ رسوم و روایات سے نجات دلانے میں ناکام رہی ہے۔ چین کے تمام صوبوں میں دُلہن اپنے شوہر کے حوالے اس طرح کی جاتی جیسے بچہ باپ کے حوالے کیا جاتا ہے۔ وہ علٰحدہ کسی گوشۂ تنہائی میں رکھی جاتی ہے اور چوروں کی طرح چھپی ہوئی اُن مسرّتوں کی تکلیفیں سہتی رہتی ہے جنھیں قسمت شوہر کے ہاتھوں اُس کے جسم مجبور پر برسا جاتی ہے۔ اس کی دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ وہ شادی کے ساتھ ہی جائداد کے سارے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے۔ انگلستان میں بھی

۱۸۷۰ء تک کوئی عورت اپنے شوہر کے حین حیات میں کسی جائداد کی مالکہ نہیں بن سکتی تھی۔ چین میں بھی بیوی کی املاک شوہر کے نام منتقل ہو جاتی ہیں اور اسی طرح شادی کے دوران میں جو کچھ اُسے اپنے ماں باپ سے ملتا ہے وہ بھی شوہر کی ملکیت کہلاتا ہے۔ لیکن چین میں ایک رعایت جو انگلستان میں ۱۸۷۰ء تک مفقود تھی، ازدواجی معاہدے میں ایک خاص توضیح کے ذریعہ عورت کو شوہر کی وفات کے بعد اپنی جائداد دوبارہ حاصل کرنے کا حق عطا کیا جاتا ہے۔

جاپان اور سیام میں موجودہ زمانے کے اثرات کے تحت معاشی پیچیدگیوں کو رفع کرنے کی خاطر قانون میں میاں بیوی کے حقوق کی توضیحیں کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ موروثی یا مشترکہ یا انفرادی طور پر حاصل کی ہوئی جائداد کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی۔ ان دونوں ممالک میں اس اصول کی پابندی کی جاتی ہے کہ شادی ایک رضاکارانہ قانونی معاہدہ ہے۔ وہاں ایک قانونی مجلس بیوی کے حقوق کا بلا تاخیر تصفیہ کرنے کے لئے مقرر ہے جو فریقین کو طویل پیرویوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ ان میں سے ہر ملک میں قانون کے یہ توضیحی دفعات

اتنے مبنی بر انصاف و عقل ہیں کہ کوئی مقنن مرد و عورت کے معاملات پر ان سے بہتر چیز پیش نہیں کر سکتا۔ سیام میں موت اور طلاق پر تقسیم جائداد کے ضابطے خاص طور پر موزوں اور واضح ہیں اور دوسرے ممالک اُن کی تقلید کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ان تمام ممالک میں بُدھی روح کی روشنی میں ازدواج ایک تعلق ہے جو قانونی معاہدہ کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور دیگر معاہدات کی طرح فسخ بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ معاہدے کے فریقین اُس پر رضامند ہوں۔ وہاں ایسے جوڑے نہیں ملتے جو اپنے اتحاد سے مطمئن نہ ہوں اور پھر بھی ایک دوسرے کی تا عمر رفاقت پر مجبور رہیں۔ دونوں آزاد عوامل سمجھے جاتے ہیں جنھیں زندگی کی کھکھیڑوں سے گذر کر اپنی روح کو پاک اور آزاد کرنا ہے۔ شادی کا مقصد آسودہ رفاقت ہوتا ہے۔ اگر یہ رفاقت ایک دوسرے کا بوجھ بن جائے تو انھیں اپنی آزادی دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کسی سمجھوتے پر پہنچنا چاہیے۔ انھیں اس سمجھوتے سے کوئی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔ جہاں باہمی سمجھوتا ممکن نہ ہو وہاں طلاق کے مقدمے عدالت میں پیش ہو سکتے ہیں۔ دوسری صورتوں میں طلاق محض رضامندی سے واجب ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی فریق حسد یا بُغض

کی وجہ دوسرے فریق کو آزادی دینے سے انکار کردے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جنون اور جلاوطنی کی وجہ رضامندی ناقابل حصول بن جائے۔ بہرحال قانون میں ہر ممکنہ صورت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ بعض حالات میں دیکھا جاتا ہے کہ شوہر نامرد ہوتا ہے اور طلاق دینے سے انکار کرجاتا ہے۔ اس لئے ہر بدھی ملک میں حکومت نے ایسے حالات کے لیے قانونی مداوا تجویز کیا ہے تاکہ غیر آسودہ رفاقتیں بلا رضامندی فسخ ہوجائیں جیسا کہ دوسری رفاقتیں قانون کی مدد سے فسخ ہوجاتی ہیں۔ ترک تعلق سے بھی قانونی طور پر معاہدے فسخ ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی شوہر راہب بن جائے تو عدالت اپنے حکم سے ازدواجی تعلقات کو ختم کردیتی ہے۔ بدسلوکی سنگین جرم اور دھریت کی وجہ سے بھی بیوی کی درخواست پر طلاق مل سکتی ہے۔ شادی کی روایات کی خلاف ورزی سے بھی ڈگری مل جاتی ہے کیوں کہ اُس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ دوسری شادی نہ کرنے کے معاہدے کو توڑنے سے بھی بیوی طلاق لے سکتی ہے۔ بدکلامی کا مشترکہ زندگی کو ناقابل برداشت بنا دینا بھی انقطاع تعلقات کے لئے کافی ہوتا ہے۔ جاپان کے قانون میں ایک توضیح کا اور اضافہ کیا گیا ہے

جن کی رو سے فریقین اپنی رضامندی کے ساتھ سرکاری رجسٹرار کو طلاق لینے کی اطلاع دیں جیساکہ وہ شادی کے موقع پر دیتے ہیں۔ ان سب بدھی ممالک میں بعض مستثنیات کے ساتھ خانگی آسودگی ایک بلند سطح پر نظر آتی ہے۔ خاص طور پر برما اور سیام میں سماج کے سارے طبقات میں جو آسودگی پائی جاتی ہے وہ دوسرے ممالک میں نظر نہیں آتی۔ ان دونوں ملکوں میں عورتوں کی غیر معمولی آزادی اور خود تکمیلی مواقع سے کوئی شوہر حسد نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو کسی خوبصورت سیامی یا برمی خاتون سے بے تکلفی کے ساتھ ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے وہ ضرور اُس کی زندہ دلی تربیت یافتہ ذہنی رجحان، تلطف آمیز جادو اور مسکراتی آسودگی کے اُس انداز سے جو اُس کے لطیف اور سڈول اعضا سے پیدا ہوتا ہے، متاثر ہوئے ہونگے

ہندو شادیاں

برعظیم ہندوستان میں ہندو مذہب کائنات اور انسان کے علتِ اولیٰ کے تعلق کو اسی انداز سے دیکھتا ہے جس انداز سے بُدھ مت دیکھتا رہا ہے۔ بُدھ مت بھی ایک ہندی مذہب ہے جو ہندی تہذیب کا خوشہ چین ہے اور جس کی تبلیغ ایک

ہندوراجاہی نے کی اور جسے ہندی مبلغین ہی نے دوسرے ملکوں میں پھیلایا۔ گو بعد میں برہمنی اقتدار نے اُسے ہندوستان کی چاردیواری میں مقیّد کر کے رکھ دیا تھا۔ تاہم ہندومت بدھ مت کی بہ نسبت اپنے عقائد کے لحاظ سے زیادہ محدود نہیں ہے۔

ہندومت کے مقابلہ میں کسی مذہبی یا فلسفیانہ نظام نے اتنی وضاحت کے ساتھ یہ بات نہیں بتائی کہ اخلاقیات اضافی ہیں اور فرائض کو عمل اور اہلیت کے ساتھ بدلنا چاہیئے۔ ہر عملِ صحیح کی منزل نیکی ہے جو ربانی آتما کی رہنمائی میں انجام پاتا ہے۔ عملی احتیاجات پر اُس کا اطلاق کرتے وقت انسانی سرگرمی کو متعدد اور مختلف سانچوں میں سے ڈھل کر نکلنا چاہیئے۔ خاص خاص ضابطے جن کی ہندو اخلاقیات پابندی کرانا چاہتی ہے اکثر ثالثی اور مصنوعی ہیں۔ بعض اوقات وہ عارضی ہوتے ہیں اور اقتدار پر موقوف ہوتے ہیں جن سے آزاد تحقیقات کا امکان باقی نہیں رہتا۔ مگر فرائض اور مراتب کے لحاظ سے امتیازات قائم کرنے میں جس بیباکی سے کام لیا گیا ہے وہ ہندومت کا اخلاقیات کو سب سے بڑا عطیہ ہے

اِن اُصول کی متابعت میں ازدواج ہندو نظام میں سارے طبقات کے لئے یکساں نہیں ہے۔ اس کے مضمرات اور

ذمہ داریاں بھی ہر جگہ یکساں نہیں ہیں۔ ہندوستانی زندگی یا نظم ونسق کے کسی مسئلے کو مختصر طور پر بیان کرنے میں ساری دقت محض اُس کے لامتناہی اختلافات اور تنوعات کی وجہ سے پیدا ہوتی۔ ہندو ازدواج پر اظہار خیال کرنے میں بھی یہی دشواری پیش آتی ہے۔

برہمنی شادی اب کیا ہے اور آج سے بیس سال پہلے کیسی تھی کوئی گنجلک پیدا نہیں کرتی۔ حال حال میں چند نوجوان مرد وعورت مغربی تصورات سے متاثر ہوئے ہیں اور رواجات وروایات سے ہٹ کر اپنے اطوار جنس سے متعلق بدلتے جارہے ہیں۔ مگر یہ اطوار اسی مغرب سے لئے گئے ہیں جس کے وہ سب سے زیادہ دشمن ہیں

غالباً آئندہ پچاس سال کے اندر اندر (اگر سماج کی روئیں یوں ہی بغیر رکاوٹ کے چلتی رہیں) برہمنی شادی کے سارے النصاب العین جو کئی ہزار سال سے پرورش پا رہے تھے، پامال اور معدوم ہوجائیں گے۔ لیکن سردست وہ کردار کے مستقل اجزا کی طرح کافی اُستوار ہیں گو اُن کے پاؤں تلے سے زمین سرکتی جارہی ہے۔

برہمنوں اور دیگر ذاتوں میں جو اُن قریبی مشابہت رکھتی ہیں اور اُن کے اخلاقی نصب العین سے لگا کھاتی ہیں، ازدواج

ایک ناقابل فسخ مقدس قانون ہے جو ربانی ہدایت کے تحت نافذ ہوتا ہے تاکہ خاندان کا سلسلہ جاری رہے اور خاندانی پرستش باقی رہے۔ اس سے محض شہوانی احساسات کی تشفی مقصود نہیں ہوتی۔ وہ عموماً بچوں کی رضامندی کے بغیر والدین کی جانب سے طے پا جاتا ہے اور ہر صورت میں یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ بیٹی کی شادی بلوغ سے پہلے یا بلوغ کے بعد ہی عمل میں آجانی چاہیئے۔

جب شادی کا معاہدہ ایسی کم سنی میں طے پا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک قسم کی قرارداد نسبت ہے یا منگنی ہے جو شادی اپنے وقت پر یا کئی سال کے بعد پوری ہوتی ہوگی۔ البتہ اس سے شادی کے سارے حقوق اور خصوصاً نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر لڑکا مر جائے تو وہ نام نہاد دُلہن بالکل رانڈ بن جاتی ہے اور ہندو قانون کی رُو سے وہ ہرگز دوسری شادی نہیں کر سکتی جس عمر میں یہ شادیاں طے پاتی ہیں اس سے فریقین کے انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر انتخاب کی اجازت بھی دیدی جائے۔ ہندو مذہب کی رُو سے ازدواج ایک ضرورت اور تجربہ ہے جس سے ہماری قسمت گزارتی ہے۔ وہ گزری ہوئی اور آنے والی نسل کی ذمہ داریاں ہم پر عائد کرتی ہے اور چونکہ وہ

خدا کا مقرر کردہ فرض ہے اس لئے اس کے آسودہ انجام کے لئے خدا کی عنایت آمیز سرپرستی کی ضرورت ہے۔ اسی لئے جوتشی طلب کیا جاتا کہ وہ لڑکی اور لڑکے کی جنم پتری کی جانچ کرے اور دیکھے کہ دونوں کی قسمت کے ستارے باہم موافق ہیں یا نہیں۔
اس طرح ربانی منظوری کے بعد شادی کی اجازت دی جاتی ہے حقیقی رسم شادی دوسری سیکڑوں رسموں کی الجھنوں سے گذرنے کے بعد انجام پاتی ہے۔ یہ ساری رسمیں مقدس ہوتی ہیں جو بھگتی اور قربانی پر زیادہ زور دیتی ہیں۔
یہ بات قابل ذکر ہے کہ برہمنوں میں چند زوجیت کی اجازت ہے اگر بیوی بانجھ ہو لیکن عملی طور پر (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) اس اجازت سے استفادہ نہیں کیا جاتا اور کہا جا سکتا ہے کہ اُس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ عورت سے مطلق وفاداری کی توقع کی جاتی ہے اگرچہ بعض مقامات پر اور پسپت اقوام میں نظریہ سے زیادہ عمل مہربان رہا ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد بھی بیوی کو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے اور اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے رنڈاپے میں مرنے والے کی یاد کے ساتھ وفادار رہے گی۔ اگر، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، وہ بچپن ہی میں دوسرے

نچے سے بیاہ دی جائے تو بیوی بنے بغیر ساری عمر رنڈاپے میں کاٹ دیتی ہے۔ مرد البتہ (اگر بوڑھا نہ ہو) اپنی بیوی کا سوگ زیادہ دن نہیں مناتا۔ اُسے دوسری شادی پر مجبور کیا جاتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ وہ دوسرے ہی ہفتہ اور بعض اوقات دوسرے ہی دن ٹھاٹ سے نکاح ثانی کر لیتا ہے۔ لڑکی سن شعور کو پہنچتے ہی بیاہے جانے پر مجبور ہے، چاہے اُس کا شوہر کم عمر ہو یا مُسن ہو

برہمنوں میں طلاق نہیں پائی جاتی اور علٰحدگی عموماً ذلت آمیز ہوتی ہے۔ ناراض شوہر اپنی بیوی کو نفرت سے ٹھکرا کر اُس کے ماں باپ کے پاس روانہ کر دیتا ہے۔ بہت کم ایک ستائی ہوئی بیوی اپنے طور پر فرار ہو کر میکے جانے کا موقع پاتی ہے۔ لیکن یہ دھتکار اور فرار آخری مجبوری کے تحت عمل میں آتا ہے۔ ورنہ عموماً بدنامی کے خوف سے میکے میں پناہ گزیں لڑکی پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے جہنم میں واپس چلی جائے۔ یہ کہہ کہہ کر اُسے تسلی دی جاتی ہے کہ دُکھ درد زیادہ سے زیادہ اس مختصر زندگی تک ہی رہ سکتے ہیں۔ زندگی کی بھی کیا وقعت ہے جو ایک لمحے میں ختم ہو جائے۔ جنم، پُنر جنم، امر جنم کا چرخ یوں ہی گھومتا رہتا ہے

برہمن قانون جائداد کی حد تک بہت پیچیدہ ہے اور مختلف

صوبوں میں اُس کی نوعیت مختلف ہے۔ عام طور پر بیوی کو اپنے شوہر کی جائداد پر اور اُس کے انتظام میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہوتا۔ شوہر کے انتقال پر ساری جائداد لڑکوں اور اُن کے دوسرے سرپرستوں اور رشتہ داروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بہت ہی شاذ حالات میں بیوی کی جائداد شوہر کو ملتی ہے۔ کبھی نہیں بھی ملتی ہے۔ لیکن وہ ہر نظام قانون کی رُو سے بیوی کی جائداد کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے اور اُس استعمال کے لئے موزوں مواقع پیدا کر لیتا ہے بیوی کا جہیز شوہر یا اُس کے ماں باپ کو فوری دے دیا جاتا ہے۔ اُس پر بیوی کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس کی واحد ملکیت اُس کا تھوڑا سا زیور ہوتا ہے جسے "استری دھن" کہتے ہیں۔ اس کو بھی وہ شوہر کی مرضی کے بغیر ٹھکانے نہیں لگا سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ برہمنوں اور دیگر مشابہ ذاتوں میں عورت ایک لونڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ شوہر اور اُس کے ماں باپ کی کامل اطاعت پر مقدس ادب زور دیتا ہے اور اس کا نفاذ تربیت یافتہ رائے عامہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسے ساری عمر تسلیم و رضا اور پتی بھگتی میں گزارنا پڑتا ہے۔ اُس کا انعام اس دنیا کی حد تک بچوں کی محبت اور عزت ہے۔

خوش قسمتی سے اعلیٰ ذاتوں میں جہاں اس نوع کی شادیاں مروج ہیں، ایک حد تک اطمینان پایا جاتا ہے مگر اُسے آسودگی نہیں کہہ سکتے۔ ہندو کردار عموماً نرم، مشفقانہ اور شکر گزار ہوتا ہے۔ اس لئے تقدیر پر خاموشی کے ساتھ قانع ہو جانا عادت بن گئی ہے۔ برہمن ذاتوں میں کافی ضبط نفس پایا جاتا ہے۔ جذبات کی شدت کم ہوتی ہے۔ تجرید اور شدید تصورات کا غلبہ رہتا ہے۔ یوگی نظام خواہشات کو دباتا اور نفس کو حواس کی ترغیبات سے بالا و برتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے پتی پتنی میں کوئی وجہ نزاع باقی نہیں رہتی۔ بہت سے جوڑے کافی قناعت اور اکثر حقیقی اُلفت کی زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ ہندو ازدواج کی بڑی سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حفاظت، خاموش الفت، غیر متزلزل قناعت اور ٹھہرے ہوئے سکون کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ ہندو ذہن کی سکون پسندی سے ہم آہنگ ہے اور جہاں کہیں یہ صورت پائی جاتی ہے وہ کامیاب رہتا ہے۔

اس کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ جہاں سکون قائم نہیں تھا وہاں ازدواج نے گہرا غم طاری کر دیا یا زندگی بھر کا رونا لگا دیا یا قتل و خودکشی کے ذریعہ ساری حکایت ختم کر دی۔ اس

نظام ازدواج نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف
عواقب پیدا کئے۔ اکثر شوہر اپنی جنسی خواہشات کی تسکین گھر سے
باہر کرتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کو متعدی امراض کا شکار بنا دیتے ہیں۔
بسا اوقات وہ اپنی محبوب داشتہ کو گھر میں لاکر بسا دیتے ہیں اور
اپنی دھرم پتنی کو باعزت خاموشی کے ساتھ اُس کی خبر گیری اور
خدمت پر مقرر کر دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی سُننے میں آئے
ہیں کہ ناراض بیوی نے خاوند کی سرد مہری اور بے پروائی کو دیکھ کر
بیسوا کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ایسی صورتیں بھی موجود ہیں کہ شوہر اپنی
بیوی کی عصمت فروشی پر جیتے ہیں۔ اس نظام کی بدترین برائی یہ
ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر لڑکیاں بکتی ہیں اور بیویاں خریدی
جاتی ہیں۔ اور بہت سی بالک پتنیاں بوڑھے قابلِ نفرت شوہر
کی شہوت یا بے پروائی پر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں اور یہ المیہ شدید تر
ہوتا جاتا ہے کہ بیوگی کے بعد پُنر بیاہ ناممکن ہے اور خوش قسمتی
سے شوہر مر جائے تو غم سے نجات پانے کے بجائے بیوہ کی
دُر گھٹنائیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس کے سامنے دو ہی متبادل صورتیں
ہوتی ہیں کہ یا تو وہ پرہیزگاری کی زندگی بسر کرے یا شرمناک
روش اختیار کرلے۔ بہر حال اس المیہ کو انگیز کر جانے کے لئے ایک

دوامی اور غیر محدود حقیقت پر غیر متزلزل یقین کی ضرورت تھی۔ اس حقیقت کے مقدّر کردہ جلوس پر انسان کی زندگی خواب کے گذرتے ہوئے سائے سے زیادہ نہیں ہے۔ اب اس نظام ازدواج میں کچھ معاشی دباؤ اور کچھ مغربی تصورات کی بدولت تغیرات ہو رہے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ فکر و عمل کی آزادی سے مقدس اور ناقابل تنسیخ ازدواج کی ستم رانیاں شدت کے ساتھ محسوس کی جائیں گی۔

آج سے سو سال پہلے ایک برطانوی وائسرائے نے اُس بربریت کا خاتمہ کیا جس کی قیمت آخری بار ایک نوجوان لڑکی نے چتا میں جل کر ادا کی تھی۔ ایسے واقعات سال میں لاکھوں مرتبہ ہوتے تھے۔ ذرا تصور تو کیجیے کہ ایک نوجوان لڑکی خرام ناز کے ساتھ بچپن کو عبور کر رہی تھی کہ ایک بوڑھے رئیس کی باہوں کو سونپ دی گئی۔ سرعت کے ساتھ چند خوف آلود بوس و کنار، گھناؤنے اُکتا دینے والے بوس و کنار اُس کے جیون کی پونجی، اور وہ جیون ساتھی جس کی ہڈیاں چٹخ رہی ہوں، جو بے پروا یا ظالم ہو، جس کے لئے اپنی نوجوان بھورانی کی گھبراہٹیں اور بدحواسیاں سامان تفریح ہوں۔ . . . اس کے بعد چند روزہ ٹھاٹ باٹ، جھروکے میں

لیٹے ہوئے صحن باغ کے فوارے کی مترنم آواز کا سننا اور بس۔ وہ ظالم رات .... داسوں اور داسیوں کی بھاگ دوڑ اور اُن کی کانا پھوسیاں۔ صحن میں مشعلوں کا جلنا، سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی چاپ اور پھر مقفل کمرے میں یہ سن لیا کہ مہاراج بیمار ہیں، وید راج بلائے گئے ہیں .... وقفے وقفے سے خبریں آرہی ہیں .... "مہاراج سخت تکلیف میں مبتلا ہیں" .... "بخار تیز ہے" ... "وہ بے ہوش ہیں" .... پھر ایک سنّاٹا .... اور انجام کار یہ خبر کہ "وہ سُرگباش ہو گئے!" دوپہر تک لاشہ مرگھٹ جائے گا۔ غمگین باجے بج رہے تھے۔ آگے سوار اور پیدل دستے چل رہے تھے۔ منتری جمع تھے کہ مقدس بھجن گائیں اور ہونے والے جُرم پر اشیرواد دیں۔ چتا کے قریب سپاہیوں کے بھالوں کے روبرو ایک درجن بیوائیں (جو آنجہانی کی بیویاں تھیں) زرد رُو، خوف زدہ اور ناگزیر انجام کے تصور سے نڈھال، کانپتی، لڑکھڑاتی آکر کھڑی ہوگئیں۔ اُن کی عمریں مختلف تھیں۔ اُن میں سے غالباً ایک نئے آنجہانی کی محبت کا پُورا پُورا لطف اُٹھایا ہوگا (جب کہ وہ دونوں جوان ہوں گے) وہ بے اختیار پھوٹ پڑی۔ باقی سب مجبور قیدی تھے۔ اور

آخری بیوی نے ابھی ابھی سولھویں سال میں قدم رکھا تھا۔۔ زندگی پر اُس کی آنکھیں ابھی کھُل رہی تھیں۔ لاش اُن کے گھٹنوں پر رکھا گیا، لکڑیوں کو آگ دیدی گئی اور ساری بیویاں جل کر بھسم ہو گئیں۔

ہندوستان میں مزدوروں اور ذہنی کام کرنے والے طبقوں میں شادی کسی قدر نرم پڑ گئی ہے۔ مگر اب بھی بچوں کے درمیان اُس کی قرارداد والدین کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن اُس نے اپنے تقدس اور استواری کو بہت کچھ کھو دیا ہے۔

وہ وحشی قبائل جو چند نسلوں کے آگے بالکل ہندو اثرات سے بے نیاز تھے اور جنھیں اب روز بروز مذہبی جوش میں ہندو مت کا حلقہ بگوش بتایا جارہا ہے، آزاد شادی بیاہ کے قائل ہیں اور اس لحاظ سے زیادہ آسودہ نظر آتے ہیں۔ نوجوان مرد و عورت باہمی کشش کی بنا پر شادی کرتے ہیں نہ کہ والدین کی خواہش پر۔ بہت سی صورتوں میں آزمائشی دور گذر جانے کے بعد ہوتی ہے تاکہ اس عرصہ میں فریقین اپنی موزنیت اور اہلیت کا اندازہ کرلیں۔ بعض اوقات نوجوان مرد سات سات سال تک اپنی محبوبہ کے گھر میں خدمت کرتا ہے اور اس اثنا میں وہ دونوں قریبی ربط

کے ساتھ یکجا رہتے بستے ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات ہونے والی دُلہن کو بہت سے کام انجام دینے پڑتے ہیں تب کہیں وہ اپنے محبوب سے شادی کا عہد و پیمان کرتی ہے۔ موت کی صورت میں دوسری شادی کی اجازت ہے اور اکثر اس سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ ان قبائل میں شادیاں عموماً وفادار اور آسودہ ہوتی ہیں

یہ ہندوؤں کی روایتی اور شاستری شادی کا خاکہ ہے۔ اعلیٰ ذاتوں میں شادی کی بہت سی تلخی کرم اور قسمت پر غیر متزلزل یقین رکھنے سے کم ہوگئی ہے۔ وہ اپنی مصیبتوں کو پہلے ہی سے مقدر سمجھ کر خاموش ہوگئے اور جو کچھ آزاد انسانی ارادے کے بس سے باہر تھا اُس سے بہترین فائدہ اٹھانے لگے۔ لیکن ان ذاتوں کے بعض نوجوانوں میں تشکک کی ایک لہر دوڑگئی ہے جو متاہل آلام کو صبر و خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں مزدور طبقوں میں طلاق کی سہولت منشور آزادی ہے جس نے خاص طور پر عورت کی خدمت کی ہے اور مجموعی حیثیت سے اعلیٰ پیمانے پر آسودگی حاصل ہو رہی ہے۔

جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے اُن کے ہاں طلاق پر کوئی مجموعہ قوانین یا کوئی تحریری ضوابط موجود نہیں ہیں۔ جب تک

برطانوی راج قائم تھا اُس کے تحت بھی کوئی عدالت طلاق کے مقدمات پر غور کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ بلکہ عدالتیں ہندوؤں کو ان حقوق سے محروم سمجھتی تھیں۔ برطانوی قانون کے تحت ایسی کوئی عدالت قائم نہ ہوئی جہاں ہندو شادیوں کے مقدمات دائر کیے جا سکیں۔ اس طرح ظاہر ہے شاستروں کی پابندی پر سارے ہندو مجبور ہیں تو ہندو شوہر اور بیوی کے آلام کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ ان غموں سے نجات پانے کی ایک ہی صورت ہے خودکشی یا قتل۔

اب ایک موہوم سی توقع کی جا سکتی کہ ہندو یونین میں اگر غیر برہمن عنصر بڑھ جائے تو قانون ساز مجالس کے ذریعہ غیر آسودہ شادیوں میں قانونی مداخلت ضروری سمجھی جائے گی۔ خاموش ہندو عوام اور دُکھیا ہندو نسوانیت ایسے قوانین کا سواگت کریں گے جن سے ان کی دُکھ گھٹائیں کم ہو سکیں۔

عیسائی ازدواج

جب ہم عیسائی ازدواج پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اُن دقتوں سے بڑھی ہوئی ہیں جو دوسرے مذاہب کے عائد کردہ جنسی ضوابط کی چھان بین کے موقع پر پیش

آئی تھیں۔ بدھ مت نے شادی بیاہ کے معاملات سے علیحدگی اختیار کر لی اور اُسے سرکاری اقتدار پر چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہے اُس کی تنظیم کر لے۔ اسلام میں قانون ازدواج احکام خداوندی کی وحدت جزو لاینفک ہے۔ لیکن ہمیشہ کے لئے اس کی توضیح و تشریح کر دی گئی ہے۔ اس میں صرف ذیلی نقاط کے سوا اختلاف رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عیسائیت ازدواج کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتی ہے اس کے برخلاف ازدواج کے بارے میں احکام خداوندی میں کوئی باقاعدہ تفصیل نہیں پائی جاتی۔ کلیسا نے ازدواج کو اپنے گھر کی چیز سمجھ لیا ہے۔ گو اس کے متعلق کوئی الہامی ہدایات انجیل مقدس میں موجود نہیں ہیں، صرف دو تین عام اہمیت کے جملے جو اسرائیلی قانون ازدواج سے متعلق ہیں، ابن مریم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ کردار کی رہبری اور جکڑ بندی کے لئے اور اپنے متاہل پیروؤں کے فرائض اور شادی کی نزاعات کا تصفیہ کرنے کے لئے، کلیسا نے صرف اپنے اسقفوں کی عقل اور تعمیری تخیل پر تکیہ کیا ہے۔ کیتھولک دنیا میں عیسائی ازدواج کے نظریئے کو آخری شکل اور سند کا درجہ حاصل کرنے کے لئے پندرہ صدیوں کا عرصہ لگا۔

سینٹ پال جس کام کو شروع کیا تھا وہ کونسل آف ٹرنٹ میں ختم ہوا لیکن پروٹسٹنزم ایک دوسری زمین پر کھڑی ہوئی ہے۔ جب کیتھولک کلیسا میں معاشری اخلاق کے اصول مرتب کئے جارہے تھے، اسی وقت یہ مسلک پیدا ہو رہا تھا۔ ان اصول میں اصلاح کا امکان تھا۔ یونانی آزادی کی سانس اور نشاۃ ثانیہ کی ترنگ میں انھیں زیادہ سے زیادہ انسانی اور عقلی بنایا جاسکتا تھا۔

مگر سینٹ پال نے ازدواج کو ایک لعنت قرار دے دیا۔ متاہل صرف ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی محبت سے لطف اٹھاتے ہیں جس کی وجہ وہ اپنے خدا کو یاد نہیں کرسکتے۔ "وہ جس کی شادی نہ ہوئی ہو" سینٹ تلقین کرتا ہے "انھیں چیزوں کی پروا کرتا ہے جو خداوند سے متعلق ہوں اس طرح وہ اپنے خداوند کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے، لیکن وہ جس کی شادی ہوجائے" دنیوی چیزوں کی خواہش کرتا ہے اور اپنی بیوی کو خوش کرتا ہے۔" گو سنٹ پال نے صاف صاف یہ نہیں کہا کہ شادی کرنا گناہ ہے لیکن وہ ہمیشہ یہ واضح کرتا رہا کہ تاہل سے زیادہ تجرد اور دوشیزگی قابل قدر ہیں۔ شادی کا بڑے سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ایسے غیر متاہل

کے لئے ایک راہ پیدا کر دیتی ہے جو اس کے بغیر اُس سے زیادہ برائی میں مبتلا ہو جانے پر مائل ہو۔ سینٹ کہتا ہے "جلتے رہنے سے بہتر یہی ہے کہ آدمی شادی کر لے" مگر جو لوگ شادیاں کر لیتے ہیں انھیں وہ افسوس اور حقارت کی ملی جلی نظر سے دیکھتا ہے اس کی تعلیم یہ ہے کہ عورت کو کوئی آدمی چھونے نہ پائے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کلیسا نے اسے تسلیم کر لیا ہے اور بعض اوقات اُس کی تبلیغ بھی کی ہے۔

کیتھولک کلیسا نے اس تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے اس کی تلقین یہ ہے کہ شادی کا مقصد بچے پیدا کرنا ہے جن سے مسیح کی اُمت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور جو خدا کی بادشاہی کو ہم سے قریب تر کر سکتے ہیں۔ شادی کا ذیلی مقصد یہ قرار دیا گیا کہ اس کے ذریعہ زنا اور فحاشی کے خطرناک گناہوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جسم کمزور ہے اور حواس ہماری تباہی کی ترغیب کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لئے کلیسا نے یہ سکھایا کہ گو سخت تجرد عیسائیت کی روح کے تحت بہترین اور مقدس ترین زندگی ہے اور عفت شعاری مرد و عورت کے لئے ایک مثالی چیز ہے لیکن کمزور قسم کے انسانوں کے لئے مباشرت

جائز ہے اگر وہ احکام مقدس کی متابعت میں عیسائی بچے پیدا کیا کریں اور جہاں تک ممکن ہو اسی مقصد کی حد تک محدود رہیں۔ کلیسا نے یہ بھی واضح کر دیا کہ متاہل جوڑے کسی عیش ونشاط میں پڑ نہیں سکتے اگر ان سے کسی بچے کی تولید ممکن نہ ہو۔ مسیح کے اس فرمان کے باوجود ازدواج میں ناپاکی کا عنصر اب تک باقی ہے اس لیئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلیسا کبھی اپنی توجہ کو مرد و عورت کے اتحاد کے جسمانی پہلو سے ہٹا نہیں سکتا اور نہ کبھی روحانی ادب یا روحانی جوش سے لطف اٹھا سکتا ہے۔ اس نے اپنے عروج کے دور میں اس نقطۂ نظر کے عواقب کو کافی استقلال کے ساتھ لوگوں پر عاید کر دیا تھا۔ اُس کا حکم تھا کہ بڑی بڑی عیدوں میں کوئی متاہل افراد حصہ نہیں لے سکتے اگر وہ گذشتہ رات ہم بستر رہے ہوں۔ اُس کا یہ بھی مشورہ تھا کہ میاں بیوی کی مباشرت صرف اضطراب کو دور کرنے کیلئے ہے نہ کہ شہوانی لذت کے لئے۔ مرد یہ بھی احتیاط کرے کہ وہ کسی فعل جماع میں اپنی بیوی کی سیری کا لحاظ نہ رکھے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف کلیسا بیوی کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو خوش رکھنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے اور دوسری طرف شوہر پر یہ سختی کہ وہ بیوی کی جنسی تشفی نہ کرے

بلکہ اُس کے جذبات بھی نہ بھڑکائے گویا اُسے ساری مسرتوں سے محروم کردے۔ اس کے علاوہ بیوی کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو سردار خاندان سمجھے اور اس کی ہر معاملے میں اطاعت کرے۔ یہ دہری سلطنت کی آزادی کا مُنہ چڑھاتا تھا۔ بہرحال عیسائیت اور جاگیرداریت نے مل کر عورتوں کی قانونی اور سماجی حیثیت کو گرانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ عیسائی ملاؤں نے جنس لطیف کی کمتری کو مستقل طور پر قائم رکھنے کی سعی کی، اور رائے عامہ کو بیوی اور بیٹی کے مفاد کی متواتر قربانی پر آمادہ کیا گیا۔ عورت کے متعلق رائے عامہ اتنی تیزی سے گرتی گئی کہ چھٹی صدی عیسوی میں کونسل آف میکن نے کلیسا کی عظیم ترین اور فاضل ترین جماعت کی موجودگی میں اس مسئلہ پر بحث کی کہ آیا عورتیں روح رکھتی ہیں یا نہیں۔۔۔ اور صرف غلبہ آرا کی مدد سے وہ اس قیمتی سرمائے کی مالک بن سکیں جہاں تک کلیسا کی تعلیمات کا تعلق ہے۔ عورت کی حیثیت قانونی طور پر مسلم نہیں ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے عملاً اس تعلیم کا اثر شوہر پر الٹا پڑا اور اُس نے زندگی کو بیوی کے لئے زیادہ سے زیادہ خوش گوار کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال یورپ میں احیائے تہذیب کے ساتھ ساتھ کلیسا کے ملاؤں کی ذہنیت بدلنے لگی اور ازدواج پر ممبروں سے خطبات دیئے جانے لگے اور نصیحت

کی گئی کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ تلطف برتے اور بیوی اپنے شوہر کی خدمت کرے۔ اور اُسے خوش رکھے۔

مسیح کی تعلیم کا ایک ہی مقصد تھا کہ روح کی بالیدگی بڑی چیز ہے۔ قانون، کردار اور جسم کے تقاضوں کی تشفی سے انسان کو بہت کم تعلق رکھنا چاہیئے۔ لائق اعتنا وہ نیت ہے جو اُبھارے وہ خیال ہے جو رہنمائی کرے اور وہ دل ہے جو سیر ہو۔ اس عقیدہ پر حیرت ہے کہ مسیح نے ازدواج کے متعلق ایسی زبلتی تنگ نظری کا اظہار کیا ہوگا اور ایک جسمانی فعل.... غالباً ایک جاودانی جسمانی فعل کے لئے سارے ازدواجی نظام کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کی ہوگی اور ازدواج کے بندھن کو کسی خطا، کسی روحانی گھاؤ، کسی اتحاد شکنی پر قائم رکھنے کی تلقین کی ہوگی۔ ازدواج ربانی چیز ہے، مرد و عورت متحد ہو کر خدا کی ذات میں ایک ہو جاتے ہیں۔ اُن کا اتحاد دوامی ہوتا ہے۔ مرض یا جنون اُسے توڑ نہیں سکتا۔ جُرم اُسے منقطع نہیں کر سکتا۔ کوفت، کرب اور ذہنی انتشار بھی اُسے منسوخ نہیں کر سکتے۔ کیا یہ بندھن جو قسمت کی طرح طاقتور اور فولاد کی طرح مضبوط ہے، عورت کے ایک جسمانی گناہ

دوبارہ اُبھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ گویا یہ فعل تقدیر کا آخری فیصلہ ہے۔ مگر ہم اسے کیسے مانیں، الفاظ سے ایسا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عقیدہ ہمارے علم کے مغائر ہے، عیسائی روح کے منافی ہے۔

سینٹ پال جنس کا کٹر مخالف تھا اور غیر یہودی اجتماعات (جنھیں وہ مخاطب کرتا تھا) غریب تھکے ماندے مزدور اور غلاموں پر مشتمل تھے جو دنیا کے ہاتھوں بڑی بڑی چوٹیں کھا چکے تھے اور اُن کا سارا اقتدار اپنے ہی مصیبت زدہ گھروں کی حد تک محدود تھا۔ عورتوں کو لونڈی بنا کر رکھنے کا جوش اور بڑھ گیا کیونکہ یہ افلاس زدہ طبقہ، متمدن اور دہریت پسند رومیوں کا دشمن تھا اور اُن کی ہر اچھی بُری چیز کے خلاف جانا چاہتا تھا۔ اُسے رومی رئیسوں کے عیش و عشرت سے حسد تھا اُسے اُن کی راحتوں سے حسد تھا۔ وہ اُن سے نفرت کرتا تھا۔ اُس کی نفرت میں کمزور اور کمینے آدمی کی تلخی تھی۔ وہ اپنے نیلے اور بھو کے خون کے ہر قطرے کے ساتھ نفرت کرتا تھا۔ وہ اپنے کوڑے کھائے ہوئے اور عرق آلود جسم کے ریشے ریشے کے ساتھ نفرت کرتا تھا۔ رومی خاتون اپنے ریشم اور ریشمینوں، مخملیں تکیوں، آرام دہ گاڑیوں، گندہ قصوں اور نظموں عطروں اور غازوں، طرب خیز ضیافتوں اور سٹیج کی عریانیوں کے ساتھ آزاد تھی

...... وہ مرد کے برابر تھی ...... وہ جائداد رکھتی تھی ...... وہ طلاق کا حق رکھتی تھی ...... وہ کسی مرد کی لونڈی نہ تھی۔ یہی خاتون مزدوروں اور غلاموں کی نظر میں ملعونہ سے بڑھ کر تھی۔ انھیں اس نمائشی گڑیا سے تنفر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں اسی قحبہ کے عیش و نشاط کیلئے محنت کرنی پڑتی ہے جو ان کی مشقتوں سے اپنے جسم کی آرائش کرتی اور ان کے پھلوں سے اپنے تن کو فربہ کرتی ہے اور اُن کی بیماریوں تکانوں، شکستہ جسموں اور کٹے پھٹے اعضا کی منفعتوں پر جیتی اور موج کرتی ہے۔ ایسی عورتیں علیسائی نہیں ہو سکتیں، منتخب انسانوں کی عورتیں ایسی نہیں ہونی چاہیئے۔ انھیں اپنے شوہروں کی اطاعت کرنی چاہیئے وہ آزاد نہیں ہو سکتیں بلکہ انھیں اپنے شوہروں کے برابر محنت کرنی چاہیئے اور اُس وقت بھی مصروف رہنا چاہیئے جب کہ وہ آرام لے رہے ہوں تا انھیں ہر وقت اُن کی راحت کی خاطر مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے شوہروں سے ہر معاملہ میں وفاداری کا اظہار کریں اور یہ جان لیں کہ وہ اپنی ابتدا ہی سے کمتر پیدا کئے گئے ہیں اور ابتدا ہی سے انسانیت کی لعنت ہیں۔

مسئلہ اولی ملی ازدواج

کرنی ہے۔ اسلام تین بڑے سامی مذاہب میں تیسرا اور آخری مذہب تھا اور اُسے مجوسیت اور نصرانیت کی مثالوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا تھا۔ قرآنی تعلیم کی رُو سے انسان کا پہلا اور برترین فرض یہ ہے کہ وہ مستحق کو اُس کا حق پہنچائے اور بشرط حق سب کے حصے تقسیم کر دے۔ دوسرے مذاہب نے ایسی نیکیوں پر زور دیا ہے جو رقتِ قلب اور جذبات کی وجہ پیدا ہوتی ہیں۔ انھوں نے محبت، خیرات اور رحم کی تلقین کی ہے مگر اسلام ایسی نیکی کی تلقین کرتا ہے جو عقل سے صادر ہوتی ہے اور سمجھ بوجھ کے سہارے چلتی ہے

عدل و احسان پر (جو کردار کا نچوڑ ہے) زور دینے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق دیگر مذاہب کے ضابطوں کے بہ نسبت انسانی تعلقات کو زیادہ قانونی عہد و پیمان کے رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ سارے توحید پرست آپس میں بھائی بھائی ہیں جن کا کردار باہمی معاہدے سے تشکیل پاتا ہے یا اُس اقرار سے جو خدا اور انسان کے درمیان عمل میں آتا ہے۔ اس تصور نے مرد و عورت کے جنسی اتحاد سے متعلق مسلمان کے نقطۂ نظر کو ڈھالا ہے۔ اسلام میں ازدواج ہمیشہ ایک مکمل معاہدہ کہلاتا ہے۔

یہ ایک سمجھوتہ ہے جو آپ کے اغراض کے تحت مرد و عورت کے درمیان طے پاتا ہے۔ گو اس میں امر الٰہی کارفرما نہیں رہتا مگر وہ بہت زیادہ دہری بھی نہیں ہے۔ اُس میں کوئی پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ وہ اسی زمین کا معاہدہ ہے اور فطری قانون کے تقاضوں کے مدنظر اُس کا نفاذ یا اُس کی تنسیخ عمل میں آسکتی ہے۔ ان معاہدات کے بنیادی اُصول اور طریقہ نفاذ سے متعلق ساری تفصیلات قرآن کریم میں نہایت واضح انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ اسلام کے سوا کسی مذہب نے اس عرق ریزی اور خلوص کے ساتھ عورتوں کے ساتھ عدل کی ضرورت پر زور نہیں دیا، اور کسی نے انھیں اپنے قوانین کے ذریعہ حفاظت کی ضمانت نہیں دی۔

وہ ضابطے جو عورت کی حیثیت کو متعین کرتے ہیں اور ازدواج اور اُس کے حوادث پر حاوی ہیں، خود آیات قرآنی میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اور فقیہوں نے اُن کی تفسیریں و شرحیں بھی لکھ دی ہیں۔ کوئی قانون ایسا مفصل نہیں ہو سکتا جس میں قرآن کی طرح ہر صورت اور اتفاق کا لحاظ کیا گیا ہو اور کوئی قانون ایسا صحیح اور قطعی نہیں ہو سکتا جس میں گمراہی کا امکان نہ ہو۔

بلاواسطہ اُس کی ہدایتوں سے متصادم نہ ہو جاری رہ سکتا ہے۔ جب کوئی مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے تو اُس کا قرآنی فیصلہ ناطق ہو جاتا ہے۔

اسلامی نظام میں پہلی نمایاں چیز یہ ہے کہ ابتدا ہی سے عورتوں کو جائداد کی ملکیت اور استعمال کا حق عطا کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنی ملکی اور موروثی جائداد سے بہرہ اندوز ہونے کا بلامداخلت کامل اختیار رکھتی ہے بلکہ اس کا شوہر زندگی بھر اُس کی حفاظت اور نگہداشت کا ضامن رہتا ہے اور مر جانے کے بعد بھی اپنی جائداد کا اُسے وارث گردانتا ہے۔ سارے مسلم ممالک میں یہ اٹل قانون تقریباً چودہ صدیوں سے جاری ہے۔ انگلستان میں پچاس سال پہلے تک کسی عورت کو جائداد کی ملکیت کا حق نہ تھا اور اب بھی وہ اپنے شوہر سے صرف معمولی سا نان ونفقہ حاصل کر سکتی ہے اور جب وہ مر جائے تو، کتنی ہی بڑی جائداد کیوں نہ ہو، اس بیچاری بڑھیا کو ایک حبہ بھی نہیں مل سکتا۔ انگلستان میں قانونی اور جائز بیوی کے حق میں قانون بے رحمی سے پیش آتا ہے اسلام داشتہ کے ساتھ بھی نرمی کا برتاؤ کرتا ہے۔ داشتہ اور اُس کے بچے نان ونفقہ اور ترکے کے ویسے ہی حقوق رکھتے ہیں

جیسا کہ جائز خاندان رکھتا ہے۔

چوں کہ عورت حصول انصاف میں مرد کی طرح آزاد ہے، اس لئے وہ شریعت کی متابعت میں شادی کے موقع پر آزاد فریق معاہدہ کی حیثیت حاصل کرلیتی ہے۔ یہ بیان کردیا گیا ہے مسلم ازدواج دوسرے معاہدوں کی طرح ایک معاہدہ ہے۔ گو اس معاہدے کے تحت بیوی شوہر سے بعض حیثیتوں میں کمتر ہے مگر اس مفہوم میں اور اس حد تک جیسا کہ ملازمت میں دو مساوی شخصیتیں اپنی آزادی اور دیگر حقوق کو کھوئے بغیر ایک دوسرے کی ماتحت ہوتی ہیں۔ اُس کی قانونی حیثیت شوہر کی قانونی حیثیت میں کسی طرح ضم نہیں ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ پہلے کی طرح شادی کے بعد بھی ہر اُس معاملہ میں آزاد رہتی ہے جو اس کے قانونی وجود سے بحیثیت ایک فرد کے متعلق ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر سے بھی معاہدے کر سکتی ہے اور ایک ان بیاہی عورت کی طرح آزادی سے اپنی جائداد کو صرف کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ معاہدۂ ازدواج کے لئے دونوں فریق کی رضامندی لازمی ہے۔ اس مسئلہ پر دونوں فرقے (سنی اور شیعہ) اور سارے دبستان قانون متفق ہیں اور علمائے قانون نے اُس ایجاب و

قبول کو فطری اور آزاد بنانے میں ایسی وقتِ نظر اور موشگافی سے کام لیا ہے کہ عقل دنگ ہے۔ ازدواجی معاہدے کے لئے فریقین کا عاقل، بالغ اور آزاد ہونا لازمی ہے۔ جب نابالغوں کے درمیان والدین کی جانب سے یہ معاہدہ طے پاتا ہے جیسا کہ بعض ممالک میں ہوتا ہے تو وہ اُسی صورت میں نافذالعمل ہوگا جب کہ فریقین سِن شعور پر اُس کی توثیق کردیں اور یہ توثیق تکمیل ازدواج سے پہلے ضروری ہے۔ معاہدے میں نیک روشی کے علاوہ بیسیوں شرائط کا اندراج کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً شوہر اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرے گا یا وہ اپنے محبوب مقام یا وطن سے مقررہ دلوں سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہے گا یا وہ اپنی بیوی کے اُن بچوں کی پرورش کرے گا جو سابق شوہر کے ہوں۔ بہر حال جو کچھ شرائط ہوں اُنھیں اچھی طرح سمجھ کر فریقین کو آزادی کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرنا چاہیئے۔ جو لڑکی پہلی مرتبہ شادی کر رہی ہو وہ اپنی رضامندی کا اظہار مسکرا کر یا سر ہلا کر کر سکتی ہے۔ لیکن دوسری صورتوں میں یہ ایجاب وقبول لسانی ہونا چاہیئے تاکہ یہ یقین کیا جا سکے کہ وہ رضا کارانہ ہے اور حالات کو پوری طرح سمجھ کر کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے بعض دلبستانِ خیال یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایسا اقرار قانون کی جانب سے

مقرر کردہ ولی کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ مہر کا معاہدہ بھی ضروری ہے جو شوہر کی جانب سے بیوی کو ادا کرنا معجّل یا موجّل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر شادی نامکمل رہتی ہے۔ شادی کے پہلے لمحے سے بیوی کو اپنا مہر حاصل کرنے کا حق پیدا ہو جاتا ہے۔ مہر معجل اور مہر موجّل کا عام رواج اکثر مسلم ممالک میں پایا جاتا ہے۔ رواج یہ ہے کہ نصف مہر یا تقریبًا نصف نکاح کے موقع پر ادا کر دیا جاتا ہے اور باقی فسخ نکاح پر جو طلاق یا موت سے واقع ہو۔ اس کا منشایہ ہے کہ ایک قسم کی تقریری تحدید شوہر پر عائد کی جائے تاکہ وہ اپنے ہی مفاد کی خاطر اپنی بیوی سے اچھا برتاؤ کرے۔ ہندوستان، پاکستان اور حیدرآباد میں ایک شائستہ اور لائق تحسین رواج یہ بھی ہے کہ اگر بیوی شوہر سے پہلے مرجائے تو وہ مرنے سے پہلے مہر معاف کر دیتی ہے یا باقی کو نظر انداز کر دیتی ہے بالفاظ دیگر وہ اپنے وارثوں کو اپنے شوہر کی خاطر اس رقم سے محروم کر دیتی ہے۔ لیکن مہر کے متعلق اتنی سخت توضیحات شادی سے قبل ہیں کہ بیوی کو اپنا حق چھوڑ دینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

چونکہ ازدواج ایک آزاد معاہدہ ہے، اس لئے اس کا انفساخ بھی فریقین کا شخصی معاملہ ہے۔ عام طور پر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ

عدالت کی مداخلت کے بغیر طلاق کا اعلان ہو جائے گا اور بدرجہ مجبوری قانون سے مدد لی جائے گی یعنی جب کہ طلاق پر کسی وجہ سے فریقین متفق نہ ہوں۔ عورتوں کے ساتھ انصاف اور اچھے سلوک کے تحفظات کے باوجود شوہر سردار خاندان اور ازدواجی اتحاد میں فریق فاضل سمجھا جاتا ہے اور عموماً اُسی کے ذریعہ طلاق کا اعلان ہوتا ہے شاذ صورتوں ہی میں شوہر معاہدۂ ازدواج میں اپنے حقوق طلاق میں بیوی کو بھی شریک کر لیتا ہے۔

لیکن عام طور پر شوہر اپنے اختیار طلاق کو بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ خود شارعِ اسلام کا ارشاد ہے کہ گو طلاق جائز ہے لیکن وہ قانونی جوازات میں خدا کی نظر میں سب سے زیادہ مکروہ ہے اور اسلامی فقہ کے سب سے بڑے امام ابو حنیفہ کی بھی یہی رائے ہے کہ طلاق اُس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ اُس کی شدید ضرورت نہ ہو۔

باہمی رضامندی سے جو طلاق دی جاتی ہے اس کا نام خلع ہے اور عموماً بیوی اپنے مہر کے کسی جزو سے دست بردار ہو کر اُسے حاصل کرتی ہے۔ جب یہ خلع عمل میں آجائے تو وہ کالعدم نہیں ہو سکتا اگرچہ کہ بعض حالات میں شوہر اُس سے انکار کر جائے۔

طلاقِ کامل کا حق فریقین ہی کو حاصل ہے اور والدین کی رضامندی ضروری نہیں ہے اور ایسی صورتوں میں بھی جب کہ میاں بیوی ایسی رضامندی کے بغیر ایک جائز شادی کا معاہدہ کرلینے کے قابل نہ رہے ہوں۔

قانونی ڈگری کے ذریعہ فسخ نکاح یا میراث بیوی کی جانب سے دائر کردہ مقدمہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شوہر اگر چاہے تو عدالت کی مداخلت کے بغیر اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے اور طلاق فریقین کی رضامندی سے بھی دی جاسکتی ہے۔ عدالت سے رجوع ہونے کی نوبت اُسی وقت آتی ہے جب کہ بیوی طلاق لینا چاہے اور شوہر اس سے انکار کرے۔ طلاق کو قانونی فیصلے کے ذریعہ حاصل کرنے کا طریقہ ایک حکم پر مبنی ہے جو شارع اسلام پر وحی کیا گیا تھا "اگر کسی عورت کو ازدواج سے ضرر پہنچے تو اُسے ٹوٹ جانے دو"

عدالت جن عذرات کی بنا پر طلاق کی ڈگری صادر کرتی ہے وہ تین گروپ میں سے کسی ایک گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اخلاقی یا جسمانی کہلاتے ہیں۔ پہلے عذر یعنی کسی فریق کے مرتد ہوجانے سے اُسی وقت نکاح فسخ ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے

قانونی ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس واقع کو قلمبند کرلیتی ہے۔ جن عذرات سے اخلاقی ضرر پہنچتا ہے اُن میں سے حسب ذیل قانونی ڈگری کے ذریعہ طلاق حاصل کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اگر شوہر اپنی بیوی کو گداگری پر مجبور کرے، اُس سے بیرحمی سے پیش آئے، داشتہ کو گھر میں لاکر لیسائے، بیوی کو نامحرمات میں سے کسی نامعلوم کے نام سے مخاطب کرے یا چار گواہوں کی شہادت کے بغیر بے وفائی کا الزام لگائے۔ اگر ان میں سے کوئی صورت بھی پیدا ہو جائے تو عدالت پر طلاق کی ڈگری دینا لازم آجاتا ہے جسمانی پہلو کی حد تک بھی قانون مساوی طور پر سخت ہے اور بیوی کے اہم مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسا کوئی قانون عیسائی ممالک میں نہیں پایا جاتا۔ اگر شوہر نامرد ہے یا نامرد ہو جاتا ہے تو فطری اور قانونی طور پر بیوی کو طلاق لینے کا حق ہے اور وہ ایسی صورت میں بھی طلاق لے سکتی ہے اگر اس کا شوہر چار ماہ کی مدت میں کسی وقت بھی اُس سے جماع نہ کرسکا ہو یا اُسے ترک کردے یا اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دے یا اُسے کپڑا اور کھانا دینا ترک کردے یا کوئی موزوں گھر فراہم نہ کرسکے۔ مختصر یہ کہ مسلم شوہر

شرعاً مجبور ہے کہ وہ اپنی بیوی کی راحت و آسائش کا خیال رکھے اور اس کی جسمانی، اخلاقی اور روحانی فلاح کو اپنا فرض سمجھے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اُسے اپنی بیوی کی استدعا پر طلاق دیدینا چاہیئے

اسلام بہ حیثیت کُلّی جنسی اتحاد کو ایک بے قابو کر دینے والا اور دوامی اہمیت رکھنے والا طبقہ سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ نہایت موثر اور پُرجوش پیرائے میں تلقین کرتا ہے کہ کسی عورت کے ساتھ ایک مرتبہ بھی صحبت کرنے سے مرد پر اُس کی اور امکانی بچے کی کفالت کی سنگین ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ وہ اس فعل کو معمولی اور غیر اہم بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ کبھی عیسائیت کے اس اجتماع ضدین کا قائل نہیں رہا کہ جنسی فعل اس قدر ذلیل ہے کہ وہ صرف ازدواج کے روپ میں گوارا ہو سکتا ہے ورنہ وہ ہمیشہ اُم الخبائث بنا رہے گا جسے تسلیم کرنا یا جس کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہیں۔

اسلام نے ازدواج کے ذریعہ جہاں حیاتیاتی بنیادی صداقتوں کو تسلیم کیا وہاں انسانی فطری کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر ادارہ ازدواج کو اس قدر لچک دار، عقلی اور انسانی

بنا دیا ہے کہ باوجود تقریباً چودہ صدی کے بے شمار سماجی انقلابات کے وہ آج بھی ویسا ہی سہل العمل اور قابل قبول ہے جیسا کہ وہ اپنے ابتدائی دورِ نفاذ میں تھا۔ اس کی لچکدار اور ہمہ گیر خصوصیات ہر صاحب سمجھ کو دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔

زناکاری

''حقیقی ازدواج زنا کو ناممکن بنا دیتا ہے''

طلاق کی کثرت نے لوگوں کی توجہ پُرانی سماجی برائیوں پر مبذول کر دیا ہے۔ زناکاری (Adultery) کی عصری تعریف ''ازدواج کی خلاف ورزی'' ہے۔ ماحول اور موقع کے اعتبار سے اس مضمون پر یک زوجی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے گی۔ ازدواج کی کوئی صورت ہو، زناکاری کے مفہوم کو بدل نہیں سکتی۔ ازدواجی حالت مکمل ازدواجیت کا نتیجہ ہے اور زناکاری اس کی بدترین

خلاف ورزی متصور ہوتی ہے۔ ہماری سماج کے موجودہ حالات میں ازدواج کا عمل دنیوی اور مذہبی رسومات کے ذریعہ ہوتا ہے اور دونوں چیزیں غیر ضروری ہیں، شکر ہے کہ شائستگی کے انحطاط سے ازدواج کی تکمیل جانبین پر چھوڑ دی گئی ہے گو اب بھی منتر جنتر احتیاط سے پڑھے جاتے ہیں اور رسوم کی ادائی پر پوری توجہ صرف کی جاتی ہے۔

دنیا کے ہر ایک حصے میں زنا کاری صدیوں سے پرورش پاتی رہی لیکن ہر زمانے میں ایسی نفرت سے اُسے دیکھا نہیں گیا جیسا کہ اس وقت دیکھا جاتا ہے۔ مذہبی دور کی انتہائی نفرت سے لے کر مادیت کے نرم برتاؤ تک زنا کاری نے رائے عامہ کے عتاب اور تعزیر کو برداشت کیا ہے۔ لیکن یہ تعزیریں اکثر عورتوں کے حصے میں آتی رہیں۔ اس گناہ کی سزا عورتوں کو اس بربریت اور بے دردی سے دی جاتی تھی (اور اُس کے برعکس مردوں کو درگذر کیا جاتا تھا) کہ اوسط ذہن کے آدمی میں زنا کا تصور صرف "گناہ گار بیوی" بن کے قائم ہو گیا تھا۔ دنیوی اور مذہبی قوانین نے زنا کے عواقب سے شوہروں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کر کے بیویوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر دیا تھا۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں اور

بعض بہت ہی گہرے ہیں۔
ازدواج کے بغیر زنا (Adulterer) ممکن نہیں "خرگوش کو پکانے سے پہلے پکڑنا ضروری ہے"
زنا کے متعلق سماجی نقطۂ نظر پر غور و خوض سے ہماری نظر ازدواجی ادارے کی اصلیت سے بھی دور ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ازدواجی ادارہ ایک قدیم شہوانی رسم کی ترمیم شدہ صورت ہے اور اس رسم کی ابتدا اُس فطری ضرورت سے ہوئی تھی جو زندگی کی طرح قدیم ہے۔
اگر ہم حیاتیاتی ادوار کی ابتدا پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عمل تناسل جد و جہد سے شروع ہو کر سکون پر ختم ہو جاتا ہے۔ صرف مرحلۂ انسانیت پر یہ قاعدہ اُلٹ جاتا ہے۔
ہم حیات کی ابتدا میں دیکھتے ہیں کہ نروں کی یہ عادت عام تھی کہ موسم وصل میں مادہ پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے انھیں جنگ کرنی پڑتی تھی۔ زنا کے اُصول اس انتہا تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیوں کہ عمل جُفتی کے ساتھ ہی وہ خاص ازدواج ختم ہو جاتا تھا۔ اور یہ نر و مادہ اسی قبیل کی دوسری مہموں میں لگ جاتے تھے۔ لیکن ہمارے نقطۂ نظر کی حماقت کا سُراغ اس سے بھی

کمتر سطح میں ملتا ہے۔

اعلیٰ تر حیوانات میں نروں کی مادہ پر قبضہ جمانے کی یہ جدوجہد مسلسل ہوتی جاتی ہے۔ نر و مادہ میں جنسی انتخابات کے ساتھ ساتھ حق ملکیت کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ان ہی احساسات کی روشنی میں جنسی تعلق کی بے ربطی کو بعد میں شادی کے نقطۂ نگاہ سے زنا کہا جانے لگا۔ جوں جوں اُنس بڑھتا جاتا، مختلف بندھن جنسی جوڑوں کو عارضی طور پر ایک کر دیتے حتیٰ کہ مادہ ایک کمزور سا حق اپنے رفیق پر جتانے لگتی۔ جب یہ جوڑے خوشگوار تعلقات قائم کر لیتے اور اُن کی خواہشات اور مذاق مشترک ہو جاتے۔ وہ جنسی اقتدار کو ایک دوسرے پر قائم کرنے کے لئے جنگ و جدل سے بھی نہ چوکتے۔ اس نوبت پر فطری ازدواج ایک واقعہ بن جاتا اور اُس کی خلاف ورزی کی سختی سے مخالفت کی جاتی۔

جب نر کا اقتدار مادہ پر قائم ہو جائے تو اُس کا احساس ملکیت بڑھتا جاتا ہے اور وہ مادہ سے زیادہ مطلق العنان بن جاتا ہے۔ اس منزل پر بھی زناکاری دوسرے حقوق ملکیت کی خلاف ورزیوں سے مختلف نہیں ہوتی اور غالباً اسی تکلیف کی وجہ اُس کی مخالفت کی جاتی تھی۔ اس دور میں ابتدائی معاشرے کا

قیام عمل میں آتا ہے اور رسم و رواج قانون بنتے جاتے ہیں جادو اور عینیت ان کی پیچیدگیوں کو نفس کے ذریعہ دیکھ رہے ہیں اور نفسیات انسانی کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ فطری ازدواج جادو کے اثر میں آجاتا ہے اور عینیت کے عروج میں ازدواج ہمیشہ ہیلے اپنی سادگی کھو دیتا ہے۔ اس طرح زناکاری کے راستے میں کانٹے بو دیئے گئے۔ انجام کار جادو اور عینیت دونوں مذہب میں ضم ہو گئے اور ملّاؤں نے مسئلہ ازدواج کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خوف و دہشت کے دور کی ابتدا ہو گئی جو غالباً کبھی ختم نہ ہو گا۔ زناکاری ایک سنگین جُرم بن گئی کیوں کہ مذہب کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ مرد و عورت کے تعلقات میں مداخلت کرے۔ قانون اور مذہب نے ساز باز کی اور سماجی اقتدار کو حاصل کر لیا۔ جنسیات کو قانون اور مذہب کی پہلی ضرب نے داخل جہنم کر دیا۔ ازدواج پر بڑا تسلط بڑی قوت کے ساتھ قائم رہا۔ اُس کا سارا راستہ مشکلات سے پُر ہے۔ وہ رسوم و روایات کا ادارہ بن چکا ہے۔ وہ انسانی ہونے کے بجائے ربانی ہے۔ عورت کی زناکاری کو اس دنیا میں بے رحمی سے سزا دی جاتی ہے اور دوسری دنیا میں جہنم کے سوا اُس کا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔ اُس کی سزاؤں کی

فہرست بہت طویل ہے۔

قانون اور مذہب کی معمولی ستم کوشیوں کے قطع نظر، عورت کے اعضا کاٹ ڈالے جاتے تھے۔ دانت اور آنکھیں نکال دی جاتی تھیں شہوت میں چُور درندوں کی آغوش میں دے دیا جاتا تھا۔ اُسے گرفتار کر کے بھوکوں مارا جاتا تھا۔ سنگیاری اور زہر خورانی کے علاوہ اُسے بچوں سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ زندہ دفن کر دینا، گلا گھونٹ ڈالنا، گرم سلاخوں سے جسم کو چھلنی کر دینا ہاتھ پاؤں باندھ کر گہرے پانی میں، ڈبو دینا، ننگا کر کے سر بازار گشت کرانا ایسی سزائیں تھیں جن کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ اس گناہ کی پاداش کے لئے خدا اور قانون کے نام پر بربریت نے ظلم اور طرز ظلم کے ایسے عجیب و غریب طریقے ایجاد کیے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آخر ان مظالم سے تنگ آ کر عورت فحاشی کی طرف مائل ہو گئی اور ذاتی طور پر میں زناکاری کی اسپرٹ کی قدر کرتا ہوں کہ وہ ان شدائد کو برداشت کرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے

مذہب کا ادّعا یہ ہے کہ وہ مشیعت اعلیٰ کا نمائندہ ہے اور بے بس جذبیلے انسانوں کے جنسی تعلقات میں مقتدر اعلیٰ کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ازدواج پر ملاؤں کی حکومت کا

منطقی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ مقننین نے سماج کی فلاح کو اپنے قوانین کا پابند بنا دیا ہے۔ ان کا نصب العین "اکثریت کی زیادہ سے زیادہ بھلائی" ہے۔ اس طرح قانون کا اقتدار معاملاتِ دل پر مسلّم ہو گیا۔ گو سارے مذاہب کے فقیہ اور پنڈت کائناتی مشیت کی تعمیل میں سرگرم کئے ہوئے ہیں لیکن آج تک کوئی مقنن اپنے قانونی کتب کے ذریعہ سماج کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکا۔ بلکہ قانون سازی کی دُھن میں فائدے کے بجائے نقصان ہی پہنچاتا رہا۔ اس کے علاوہ مذہبی اور دنیوی اقتدار ہمیشہ مردوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس لئے زنا کاری کے عواقب عموماً عورت ہی کو بھگتنے پڑے اور چونکہ وہ ایک حقیر جنس سمجھی جاتی ہے اس لئے وہ وحی والہام سے محروم رہی اور احکام خداوندی کی تعمیل کروانے کی سعادت اُس کے حصّے میں نہ آسکی۔

یہ قصّہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ دنیوی اور دینی اقتدار کو ایک سیاسی ادارے کی نشوونما سے بھی تقویت پہنچی جس کی روح سرمایہ داری بھی اور ہے۔ اس طرح سیاسی اور اخلاقی نظامات اپنی خامیوں کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے لگے اور اعمالِ خیر میں ایک دوسرے کے مزاحم ہوتے رہے۔

اس طرح سرمایہ داری اور مذہب کا اتحاد مثالی ہوگیا۔ دونوں انسان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک قانون سے ڈراتا ہے اور دوسرا عذاب خداوندی کی دھمکی دیتا ہے۔ غم تو اس کا ہے کہ نوع انسانی کی جہالت اس خوف پر اصلیت کا رنگ چڑھا دیتی ہے اور مذہب و سرمایہ داری دونوں مل کر انسان کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیتے ہیں۔ ایک جسم کو اور دوسرا ذہن کو زنجیریں پہنا دیتا ہے۔ دونوں عورت کو اپنا غلام بنا کر زیادہ سے زیادہ انسانی پیداوار کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اُس پیداوار سے نفع اندوز ہو سکیں۔ دونوں فحاشی کے کامیاب پروردگار ہیں۔ مذہب اپنے ازدواجی نظام کے اور سرمایہ داری اپنے معاشی نظام کے ذریعہ۔ مُلّا اور سیاست داں دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ نظام اخلاق اپنے کھوٹے معیارات کی بنا پر ازدواج اور طلاق کی پیٹھ ٹھوکتا ہے اور مرد و عورت کے باہمی تعلقات نیز سیاسی اور ملکی حقوق کے متعلق غلط تاویلات سے کام لیتا رہتا ہے۔ اس کے عناصر خیر اپنی باہمی نزاع کی بنا پر اس قدر ضعیف ہو چکے ہیں کہ وہ شدید سماجی برائیوں کے خلاف کوئی محاذ قائم نہیں کر سکتے۔

ہمارے مقبولہ اخلاقی معیار کے مطابق مرد کا یہ حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ ایک بچہ اس کا ہے یا نہیں۔ لیکن ایک بھونڈے قسم کا مرد ہی اپنے طرز کا انحصار اس علم پر کر سکتا ہے۔ بچے اپنے باپ کو جاننے کا حق رکھتے ہیں۔ قانون گویا اپنا ابتدائی حق جتاتا ہے جب وہ بچے کے حسب و نسب جاننے پر اصرار کرتا ہے۔ کیوں کہ قانون سرمایہ دارانہ ہے اور سرمایہ داری اپنے حقوق ملکیت اور خصوصاً موروثی حقوق کے بارے میں بڑی کائیاں ہے۔ مرد کو اپنی زناکار بیوی کے اثرات سے محفوظ رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ اپنی خودداری کا بھی محافظ ہے۔ اس کا مقدس فرض ہے کہ وہ زندگی کے چشمے کو شفاف رکھے اور ان عناصر سے بچائے جو اُسے گدلا کرتے ہیں۔ یہ

اُس کا اخلاقی منصب ہے کہ وہ خبیث عادات سے پرہیز کرے امراض سے دور رہے اور ناپسندیدہ حسب نسب سے گریز کرے۔ یہاں کہا جا سکتا ہے کہ جو حق مرد کو حاصل ہے وہی حق عورت کو بھی ملنا چاہیئے۔ جو سلوک مرد کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی عورت کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عورت کی ذرا سی لغزش مرد کے بڑے سے بڑے جُرم سے بدتر سمجھی جاتی ہے۔ بعض فلسفی، اور جنسیات کے مصنفین کی یہ روش ناقابلِ برداشت ہے۔ مرد کی خود بینی عورت کی خودداری سے زیادہ مقدس کیوں ہے؟ اُس کی صحت عورت کی صحت پر کیوں مرجح ہے۔ امراض خبیثہ سے بیویاں اور اُن کے مضرات سے بچے متاثر نظر آتے ہیں لیکن قانون ساز اور فقیہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

جادو اور عینیت اپنے جنتر منتر، بھوت پلید کے خوف اور رسوم کے ساتھ، مذہب اپنی ربانی طاقتوں کے ساتھ، سیاست اپنی ہیبت ناک معاشی نظام کے ساتھ اور اخلاقیات اپنے صحیح اور اور جھوٹے معیارات کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک عجیب و غریب نفسیات کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس طرح ازدواج اور

طلاق فحاشی کے موجب بن کر نوع انسان کو بے اندازہ مضرت پہنچا رہے ہیں۔ غرض کہ زناکاری تقریباً ایک افسوسناک ضرورت بن گئی ہے۔

حال حال میں لامذہبیت اور — مادیت نے مذہب کے اثرات، قانون کی حماقت، سیاست کی خباثت اور اخلاق کے چھوٹے معیار کے باوجود سماج میں کچھ طاقت حاصل کرلی ہے اور وہ ازدواج کو سچّی رفاقت اور محبت پر مشروط کر کے ازدواجی روایات میں حقیقی سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کیونکہ یہ ہمارا عام تجربہ ہے کہ موزوں رفاقت، ازدواجی رسمیات کی پروا کئے بغیر وفادار ثابت ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر دہریت نے ناموزوں رفاقت کے جنسی تعلقات کی بداخلاقی پر زور دے کر سماج کے ایک قلیل طبقے کی اصلاح کر دی ہے۔ اس طبقے میں خاندان بے داغ ہے۔ شوہر اور بیوی کے باہمی تعلقات خوشگوار ہیں۔ وہ مباشرت میں حفظ صحت کا خیال رکھتے ہیں اور اپنے رضاکارانہ توالد وتناسل میں محتاط رہتے ہیں۔ یہ شوہر اور بیویاں جانتی ہیں کہ محبت کی زنجیریں پھولوں سے زیادہ وزنی نہیں ہوتیں۔ خوف اور قید میں رہ کر وفاشعاری لائق تحسین نہیں۔ زنا اصل

واقعہ کا ایک جزو ہے۔ کیونکہ خلاف ورزی کا بہت بڑا حصہ ــــ بے وفائی وقوع فعل سے پہلے دل میں موجود رہتی ہے۔ اگر اس زمین کے اُن برگزیدہ انسانوں کو جنھوں نے کبھی اپنے دل میں زنا کا ارتکاب نہیں کیا، ایک چھوٹے سے حجرے میں جمع کر دیا جائے تو اس میں گنجائش باقی ہی رہے گی۔

زناکاروں کی ساری مصیبت یہ ہے کہ وہ متحد نہیں ہیں۔ اگر وہ اپنے آپ کو منظم کر کے ایک ہو جائیں تو کوئی کھٹکا باقی نہ رہے۔ فقدانِ اتحاد اس مشرب کی واحد کمزوری ہے۔ وہ ایک ہو کر دشمن کو مغلوب کرنا نہیں چاہتے۔ بھائی اور بہنیں ایک دوسرے پر غلاظت اچھالتے رہتے ہیں۔ ہر شخص اپنی عریانی کو ڈھانکنے کے لئے دوسرے کی لنگوٹی تک چھین لیتا ہے۔ بعض ان لکھے قانون کی متابعت میں "جائز قتل و قتال" پر اتر آتے ہیں مگر یہ سب قتل زناکارانہ ہوتے ہیں۔ البتہ فوری، آسان اور باعزت طلاق ان کا انسداد کر سکتی ہے۔ مگر جب وہ اُسے چاہتے ہیں وہ اُن کے منشاء کو پورا نہیں کرتی۔

نئے زاویہ نظر سے زنا کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اُسے شائستگی کی خلاف ورزی نہ کہ جرم اور

گناہ سمجھ کر قلم اُٹھانا چاہیئے۔ زنا کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جسے قدیم عینک سے ہی دیکھنا چاہیئے جو خبیث زناکاری کی ایک ہی قسم ہے اور وہ کبھی نہیں بدلتی۔ زنا برائے ظلم یا برائے شہوت ناقابل عفو ہے۔ کمینہ زناکاری برائے زر یا برائے اقتدار محض قابل نفرت ہے۔ خبیث زناکاری محض حظ نفس اور عیاشی کی خاطر انتہائی نفرت کی مستحق ہے۔ ان سب خلاف ورزیوں کے لئے سماج کے پاس سخت ترین ملامت کے سواء کیا ہو سکتا ہے۔

اب ہم محسوس کر رہے ہیں کہ مرد کے بہ نسبت عورت کے حق میں زنا بدترین اخلاق تصور ہوتا ہے۔ جنسی معانقہ کبھی اخلاقی نہیں ہو سکتا جب کہ وہ جانبین کو مشتعل کر دے چاہے ازدواج سے پہلے چاہے ازدواج کے بعد فہم عامہ کے نزدیک حقیقی زنا ایک گھاؤ ہے، معصومیت پر ایک داغ ہے۔ جو شوہر اپنی بیوی کی محبت کو قائم نہیں رکھ سکتا وہ اُس کا مستحق بھی نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں اگر وہ اُس کو نظر انداز کر دے تو اُس میں اُس کا کوئی نقصان نہیں۔ جو کچھ کھو سکتا ہے وہ یقیناً کچھ پا سکتا ہے۔ ہماری انسانی دنیا کے خطرے ایسے ہی ہیں۔

زنا کی ایک قسم دفاعی زنا بھی ہے جسکی بڑی آسانی سے حمایت کی جاسکتی ہے۔ شوہر اور بیوی میں سے کسی کی محبت ختم ہو جاتی ہے ان میں خوشگوار تعلقات باقی نہیں رہتے سماج طلاق کی اجازت نہیں دیتی۔ کوئی استدلال اُن کی نفرت بھری علیحدگی کو رفع نہیں کرسکتا۔ رضا کارانہ تجرد بو العجبی ہے اور جبری تجرد (پرہیز) اُس سے بدتر ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک عورت اپنے شوہر سے محبت کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ شائستہ اور خوددار بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کی محبت، شوہر کے بیزار کن اعمال اور ظلم وستم سے سرد پڑ چکی ہو۔ بہر حال وہ ایک ناقابل عبور مجبوری کی وجہ اب بھی قانون اور مذہب کی رُو سے اُس کی بیوی بنی ہوئی ہے۔ شوہر اس کے جسم کا مختار مطلق ہے۔ مگر عورت ایک ایسے شخص سے محبت کا اظہار کرنے لگتی ہے جو اُس سے بھی محبت کرتا ہے۔ اُس کی دلجوئی کرتا ہے اور اُس کی زندگی کو ایک ٹھوکا دے کر بیدار کردیتا ہے۔ ایسی صورت میں اس عورت کی زندگی محض اس لئے تباہ کردی جاتی ہے کہ طلاق کا ہوّا دل ودماغ پر مسلّط ہے اور فہم عامہ ابھی سورہی ہے ازدواجی زندگی بہت سے سانحوں میں سے ایک سانحہ ہے جب کہ زنا، زنا نہیں رہتا اور کوئی جھوٹ

اور واہمہ اُسے زنا کہہ نہیں سکتا۔ انسانی انصاف کے مطابق ایسی شادی تو عملاً منسوخ ہو جاتی ہے۔ اب جو کچھ باقی رہ جائے وہ تو ہمات کا ایک خول اور المیہ کا ایک کھنڈر جسے سماج کا ایک احمقانہ طرز ہموار نہیں کر سکتا۔ اور اس سانحہ کا بھگتاؤ فریقین کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی ہزاروں مثالیں بیان کی جا سکتی ہیں ایک شادی شدہ جوڑا اُونگھتی اُداس اور رسمی زندگی سے تنگ آ جاتا ہے۔ پُرانی امنگیں فرسودہ ہو جاتی ہیں۔ پُرانی خوشیاں ٹوٹی پھٹی جوتیوں سے زیادہ وقیع نہیں رہتی جو باورچی خانے میں کہیں پڑی ہوئی رہتی ہیں۔ جوش، مردہ گدھے کی طرح ختم ہو جاتا ہے۔ بیوی گھر غلامی کی یکسانیت سے مری جاتی ہے۔ دفعتاً وہ کسی خیال سے چونک پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اُس کے بحرِ مراد میں کوئی طوفان سا آ گیا۔ وہ سارے بندھن توڑ کر نکل جاتی ہے۔ مگر اس کا احساس فرض بچوں کی یاد دلا کر پھر اُسے چکّی کے کھونٹے سے باندھ دینے کے لئے واپس بُلاتا ہے۔ سماجی دباؤ ابلہ فریبی سے کام لیتا ہے۔ وہ زندگی کی بے کیف دنیا میں پلٹ آتی ہے اور اپنے معمولی مشاغل میں مصروف ہو جاتی ہے۔ گورستان کے اس کنج میں بڑی مسرت کے ساتھ

وہ اپنے چھوٹے سے راز کو دبائے پڑی رہتی ہے۔

ہمیں انصاف اور راست بازی سے کام لینا چاہیے۔ کیا اُس کی اُمومت داغدار ہے؟ کیا وہ اوسط انسان کی نظر میں ایک بدتر بیوی ہے؟ میری رائے میں وہ ٹھوکر کھا کر بہترین لونڈی بن چکی ہے۔ وہ کھوئے ہوئے ضمیر کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں صبر و مشقت کی حسین دیوی نظر آرہی ہے۔ کیا سماج اُسے قانون کے حوالے کر کے کچھ پھل پا سکے گی؟ کیا اخبارات کے اُس کی باقاعدہ رسوائی اُس کے بستر مرگ کو پاک کر سکتی ہے؟ اِن سوالات کا اطلاق بد رویہ شوہر پر بھی ہوتا ہے۔ کیا اُسے بحیثیت شوہر کے زیادہ سے زیادہ متحمل، اور باپ کی حیثیت سے شفیق اور ایک کامیاب کاروباری کی طرح کھرا نہ ہونا چاہیے؟

ہم جانتے ہیں کہ روزانہ لاکھوں قسم کے زنا ہر مہذب ملک کے معزز طبقوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ ارباب حکومت، علما، صدور سلطنت، سیاست داں، میزان عدل، مدبرین، اور تاجر سب کے دامن سیاہ نظر آتے ہیں۔ اگر ان سب کو پکڑ کر ایک گھنٹے کے لئے جیل میں بھر دیں تو دنیا کی ساری سرکاری عمارتیں انھیں ایک صدی کی کوشش کے بعد بھی سمو نہ سکیں گی اور

تمدن کی کَل رُک جائے گی۔ یہ کہنا دشوار نہیں ہے کہ زنا کا مسئلہ اخلاقیات سے زیادہ حفظ ذات اور خصوصاً جذباتی اعتبارات سے تعلق رکھتا ہے جس کی صداقت مسلّم ہے۔ ممکن ہے کہ فطرتِ انسانی کا اخلاقی پہلو اُس سے غیر متاثر رہے۔ اخلاقی عناصر اپنے اطلاق کے انتقال سے ضائع نہیں ہوتے۔ واقعات کے درمیانی روابط واقعات کو متاثر کئے بغیر، منتقل ہو سکتے ہیں ایک عورت جو زید کی وفاشعار بیوی رہ چکی ہو، بکر کی بیوی بننے کے بعد بھی اُس خصوصیت کو برقرار رکھتی ہے مگر سماج اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ میں تغیر پیدا کرنے کے لئے دلدل سے گزر جائے۔ عشق و محبت کی بہت سی گراں قدر وفاداریاں انجام کار زنا سے داغ دار ہو کر رہیں۔ سماج عورت سے جن قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے، وہ فعل زنا کو صرف مضبوط یا کمزور کردار کے لیے ممکن بنا دیتی ہیں۔ اُس میں اعلیٰ قسم کی جرأت سے کم کوئی چیز نہ ہونی چاہیے۔ وہ خوب تر یا بدتر بننے پر مجبور ہے... کیوں کہ وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔

ہمیں زنا اور قانون کی دوسری سخت ترین دفعات کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو کسی قدر نرم کر لینا چاہیے۔ قانون کے

مصنوعی خوف کو قائم رکھنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ سماج اس برائی کو آسان، فوری، خاموش اور باعزت طلاق کے ذریعہ بہت بڑی حد تک گھٹا سکتی ہے۔ عورتوں میں اپنے جسم کی آزاد بادشاہی کا احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ حسب ضرورت اپنے رفیق کا انتخاب کرلیں۔ بیویوں کو بھی شخصی دلکشی کو قائم رکھنے اور غیر رضاکارانہ شادیوں سے نجات حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہیئے کیوں کہ ایسی شادیاں اور توالد و تناسل اپنے کمال پر بھی زنا کی انتہائی خباثت کے مقابلے میں بدتر ہیں۔ سماج نامکمل ازدواج کے مظالم کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جو زنا سے بدتر ہوتے ہیں۔ جیسے مقدس اعتماد کی خلاف ورزی جبکہ جانبین انتہائی خلوص کے ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیتے ہیں۔ (عیسائیت) یا شوہر کا زنا بالجبر جب کہ اس کی بیوی اپنی تکان اور کمزوری کے سبب مدافعت نہ کرسکتی ہو۔ فطرت نے جنسی فعل کے امکانات پر مردنما عورت کی جانب سے روک تھام کا انتظام کرلیا ہے۔ اب سماج کو چاہیئے کہ وہ ظالم شوہر کی حیوانیت پر قابو حاصل کرے۔ ایک بے یار و مددگار کتیا قوانین فطرت کے تحت اپنے جسم کی مالک مطلق ہے مگر انسانی بیوی خدا اور

انسان کے قانون کے تحت اس اختیار سے محروم ہے۔ شوہر کی خود غرضانہ ظالمانہ اور قابل نفرت کمینگی سے قطع نظر (جو بیوی کو اُس کی مرضی کے خلاف استعمال کرنے میں ظاہر ہوتی ہے) اُس کا یہ بزدلانہ فعل تناسلی اور حیاتیاتی اُصول کے صریحاً خلاف ہے۔ اس مسئلہ کا ایک پہلو جو ہماری توجہ کا مستحق ہے، آدابِ مباشرت کی نفسیات اور سماج کی فلاح کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ اس پر آج تک کافی علم کے بغیر اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے یا جو کچھ لکھا گیا ہے جذبات میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔

ہر چیز کی نفسیات مکمل ہوتی ہے۔ جذبات کا اعلیٰ نظام جنسیت کے تعلق سے غیر معمولی طور پر پیچیدہ ہوتا ہے اور کسی قدر یہ پیچیدگی دونوں جنسوں میں مختلف ہوتی ہے۔ ان اختلافات کو اپنے مختلف روابط کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کے بغیر ہم چند آسان اور مسلمہ اصول کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اُصول اخلاقیات سے راست تعلق رکھتے ہیں کیوں کہ وہ صاف طور پر جرم اور معصومیت کی شخصی ذمہ داریوں سے مربوط ہیں۔ سماج کا بہت بڑا حصہ مرد و عورت پر مشتمل ہے جو

فطری طور پر محبت کے ذریعہ اپنی تشفی چاہتے ہیں۔ اُن کی خواہشات اور اُن کے رُجحانات معصیت خیز اور غیر اخلاقی نہیں ہوتے۔ ان کی جنسی خواہشات بلحاظ نوع طبعی اور بلحاظ مدارج قوی ہوتی ہیں۔ ان کے جذبات نمویافتہ مگر ہمیشہ متوازن نہیں ہوتے۔ اُن میں غدودی اور اعصابی نظام بھی پائے جاتے ہیں جو اُنھیں ناموزوں تناسلی رواجات سے ملتے ہیں۔ یہ افراد قانون سازی یا تربیت کے ذریعہ جنسی پرہیز پر مجبور نہیں کیے جا سکتے۔ قانون ان کی ضرورتوں کو کالعدم نہیں کر سکتا اور رسوم ان کی خواہشات میں پیوند نہیں لگا سکتے۔ وہ بچھڑوں کی روک ٹوک کے باوجود ایک بھرپور زندگی کا لُطف اُٹھانے پر تُلے ہوئے ہیں، خواہ یہ بچھڑے انسان ہوں یا دیوتا ہوں۔

فرض کیجیے اس جماعت کی ایک عورت کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ ناموزوں رفاقت کے جوئے میں جوت دی جاتی ہے (جس میں اُس کا کوئی قصور نہیں ہے) مگر اپنی بندھی ٹکی قسمت کو کسی طرح بدل نہیں سکتی۔ ماحول کا دباؤ ولادت کا حادثہ، حالات کا تقاضا، شوہر کی مخلص لیکن بے کیف ہمدردی، اُس کے دوست اقربا، خود اُس عورت کا فطری عزو احساس فرض، سب جا

خوف وہراس پر یقین مہمل رسوم اور مذہب کی مبتذل چاندنی۔۔۔ یہ سب مل کر "اُسے اپنی جگہ سے سرکنے نہیں دیتے" ممکن ہے کہ شوہر کی ہمدردی اس کے اعصاب پر گراں گذرتی ہو۔ وہ جو کچھ چاہتی ہے نہیں پا سکتی۔ اُس کی خواہش کو جھوٹی شرم دبا دیتی ہے۔ وہ اپنے کردار کے متعلق غلط فہمی کا خطرہ مول لئے بغیر اپنی تمناؤں کا اظہار نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی فطرت کی ضرورتوں کے لحاظ سے اپنے پرستار کی خواہش مند ہے۔ وہ بہیمانہ شہوت سے مطمئن نہیں ہے۔ اُس کا جنسی وجود نیازمندیوں کا طالب ہے۔ ایسی عورت کتنی ہی شرافت اور قربانی سے کام لے (بلکہ اُس کی یہ صفات اُسی کے حق میں مضر ہیں) کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ وہ اُس شوہر کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی خواہ وہ دیگر اعتبارات سے کتنا ہی شفیق ہو۔ جو کچھ وقوع میں آتا ہے اُس کے قوی ارادے' اُس کے ہیجان اُس کی صحت کی عام حالت' اُس کے غدود کی فعالیت' اُس کی نفسیات کی فطرت اور اُس کے اندرونی تلاطم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ایسی عورت اپنے چھوٹے سے باغ کے باہر محبت کے شاداب پھول کھلتے ہوئے دیکھے تو کون ایسا انسان ہوگا جو اُسے اُن پھولوں سے اپنا دامن بھرنے کی اجازت نہ دے۔ اگر کوئی

پھول اُس باغ کے احاطے کے اندر آ پڑے یا کوئی رسیلا سیب اُس کے ہاتھوں میں آجائے تو کون اُسے خطاوار کہہ سکتا ہے جب کہ وہ خوبصورت بھی ہو۔ یہ سب باتیں المی اور طربی دونوں خصوصیات کی حامل ہیں۔ ذی فہم لوگ اعتراف کرتے ہیں کہ جنسی فعل ازدواج کے سائے میں ناجائز، مکروہ اور بہیمانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اُسے خالص، بے غرض اور حقیقی بنا دیا جائے گو قانون اور مذہب اُسے پسند نہ کریں؟ مختصر یہ کہ کیا زنا واقعی ایک غلط اور بُرا فعل ہے؟ کیا اس میں کسی استثنا کا امکان نہیں؟ اگر ہے تو بہت سے مستثنیات پیدا ہو سکتے ہیں ..... لیکن کیا اُس ایک بھی یقین ہے؟

کچھ ہی ہو زنا بُری طرح بدنام ہے۔ یہ فعل خلاف قانون ہے اس لئے وہ ایک جُرم ہے، صحیح یا غلط یا کم از کم وہ ایک قسم کی بدروشنی ہے۔ یہ فعل مذہبی نواہی کی خلاف ورزی ہے اس لئے وہ ایک گناہ ہے۔ وہ شائستگی کے حقوق کے خلاف جاتا ہے اس لئے وہ ایک سرقہ ہے اگرچہ کہ جو کچھ چُرایا جاتا ہے وہ ضائع نہیں ہوتا۔ زنا غیر مفید ہے اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی۔ روایات کی رُو سے زنا ایک ذلیل فعل ہے اس لئے

اسے دبا دینا چاہیے۔ زنا ایک غیر مشتبہ شوہر کو ناواجبی پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے اس لئے یہ فعل غلط ہے۔ ممکن ہے کہ زنا سے ایک معصوم شخص کو قابل نفرت مرض لاحق ہو جائے، اس لئے وہ بُرا ہے۔ اگر وہ بچے کی زندگی کو داغدار بنا دے تو لائق ملامت ہے۔ اسی طرح اگر زنا سے مرد کی آبرو خاک میں ملتی ہو، اُس کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہو یا اسے دوسرے دیوّسوں میں نکوّ بنتا پڑتا ہو تو یہ فعل واقعی لائق نفرت ہے

یہاں چند بے ضرر تقابلات پیش کئے جاتے ہیں۔

پڑوسی پر تشدد کرنا غیر آئینی ہے۔ مگر یہ غیر قانونی فعل نیکی بن جائے گا۔ اگر اس کی فلاح کی خاطر یا جماعت کے مفاد یا فرد کی حفاظت، اُس کے حقوق، اُس کی عزت یا کسی دوسرے کی آسودگی کے لئے کیا گیا ہو۔ اس لئے یہ امر قابل غور ہے کہ زنا کے خلاف سارے قوانین کسی اچھے مقصد کے لئے توڑ دیئے جائیں کیوں کہ بہت سے تقدس مآب نہایت بے خوفی کے ساتھ بیشمار گناہوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ رسوم کا جمود، قوانین کی سختی اور مذہب کی ضد ہمیں مجبور کر دیتے ہیں کہ ہم کسی قدر انفرادی محرک اور فیصلہ پر بھروسا کریں جب کہ سماج بھی ترقی سے منھ

پھیرے بیٹھی ہے۔ سماج کس طرح قائم ہوئی؟ سماج کے لئے انفرادی ذہانت اور عمل کی رہبری کے سوا، ترقی کا اور کون سا ذریعہ ہے؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرد کو اپنی بیوی کی مرضی کے خلاف اُس کے جسم پر کوئی حق ملکیت حاصل ہے؟ یہی سوال بیوی پر بھی یکساں طور پر چسپاں ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ دونوں ایک دوسرے پر حق ملکیت رکھتے ہیں مگر قانوناً کونسا صحیح ہے۔ کیا وہ شخصی، خانگی اور روحانی حقوق ہیں یا جذباتی حقوق ہیں جو قانونی اور مذہبی حقوقِ ملکیت کے مغائر ہیں؟۔ ہاں ایسے حقوق موجود ہیں اگر ہم عقلی انسان ہیں۔ زنا کی مثال مضر ہے لیکن اُسے ازدواج سے زیادہ خلوتی فعل بنانے میں کونسی عقلمندی ہے؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ خلوتی زنا سے منافقت کا اظہار ہوتا ہے کیا خلوتی زنا ازدواجی فعل سے زیادہ منافقت کا حامل ہے جبکہ وہ خاص طور پر ڈنکے کی چوٹ مشتہر نہیں کیا جاتا اور ازدواج کی پھوہڑ رسوم سے بھی اُسے گذرنا نہیں پڑتا۔ کیا خفیہ زنا ان مشاغل سے زیادہ منافقانہ ہے جو مقدس خلوتوں میں جاری رہتے ہیں؟ چونکہ روایتی ضمیر اور سماج کی موجودہ اُفتادِ طبیعت نے زنا کو ذلیل

سمجھ رکھا ہے' اس لئے زنا کی سربستگی ہی اُس کی مُسلّمہ خوبی ہے۔ یہ ضمیر اُس جادو اور عینیت کا جو نتیجہ ہے جو ہمارے مذہب اور اخلاقیات کے تصورات میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور جنھوں نے ہماری نفسیات کو متاثر کیا' اخلاق میں بس گھول دیا اور قانون کو حیوانی بنا کر رکھ دیا۔ کیوں کہ صرف کھُلا زنا ہی ذلیل ہو سکتا ہے۔ خفیہ زنا کسی فریق کو ذلیل نہیں کرتا۔ اگر اس دنیا میں کسی چیز پر یقین کیا جا سکتا ہے تو اس سے زیادہ لائق یقین کوئی بات نہیں کہ ان گنت گرامی نفس اور شرفائے کرام (مرد وعورت) خود کو یا دوسروں کو گزند پہنچائے بغیر اس شغل میں صدیوں سے مصروف رہے ہیں اور مصروف ہیں۔

اس مختصر مقالے کا مقصد زنا کی حمایت نہیں ہے بلکہ اُس کے اسباب کی جانچ کرنا' اُس کے انسداد کی تدبیر معلوم کرنا اور اُس کی ناگوار ضرورت پر اظہار افسوس کرنا ہے۔ یہ سب سماج کی حماقت کا نتیجہ ہے۔ سماج نے روایتی ضوابط سے ایک فطری قانون میں رکاوٹیں پیدا کیں اور اب اُسے اپنے ہی کرتوت کا خمیازہ بھُگتنا پڑ رہا ہے۔ تولیدی جبلت اور اُس کو قابو میں رکھنے والے اُصول ہر سماجی تنظیم کے اوامر و نواہی سے برتر ہیں۔

اس جبلّت کے جو اثرات سماج پر پڑتے ہیں انھیں ایک معقول حد تک جماعتی بھلائی کے سرچشموں میں جھونکا جا سکتا ہے۔ جب تک یہ فطری وظائف عام رجحان سے ہم آہنگ رہیں، اور ملت کے لئے بیضرر رہیں۔ سماج کو مداخلت کرنے یا اُنھیں دبا دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مرد و عورت اپنے جسمانی اعضا اور ذہنی ملکات کے استعمال اور جذباتی وظائف سے لطف اندوزی کا فطری حق رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انھیں صحت اور آسودگی کو حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔

ہر شخص تجرد کی نفسیاتی برائیوں سے واقف ہے۔ ایک جنسی بالغ میں یہ برائیاں اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ ایک عامی بھی اُنھیں دیکھ سکتا ہے۔ مجرد کی بگڑی ہوئی جسمانی کَل کا سُراغ اُس کی خود فریبیوں، غیر ضروری مذہبی جوش، واہموں اور انحرافات میں ملتا ہے۔ بعض اوقات ذہنی اور اعصابی اختلافات بھی واقع ہو جاتے ہیں۔ وہ بے نالی غدود جو جنسی اعضا کو حرکی قوت فراہم کرتے ہیں اور ذہنی قویٰ کی قابو میں رکھنے کے ذمہ دار ہیں، عدم استعمال سے زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ یہ غدود وقت سے پہلے مرجھا جاتے ہیں اور وظیفی اعمال کو دبا دینے سے

اُن میں ریشے پیدا ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ غیر طبعی حالات سے بُری عادتیں پیدا اور راسخ ہو جاتی ہیں جن سے شخصیت کو دوامی گزند پہنچ جاتا ہے ایک غالب اور بنیادی جبلّت کی مزاحمت، شخصی فلاح کو نقصان پہنچائے بغیر ممکن نہیں، تولیدی جبلّت دوسری جبلتوں اور محرکات زندگی سے آزاد ربط و ضبط رکھتی ہے۔ پودوں میں بھی یہ جبلت پائی جاتی ہے میرا خیال ہے کہ اُس کا گہرا تعلق حیوانی تناسل کی زیریں سطحوں شگفتی اور مواصلت سے ہے۔ جس طرح بلندیوں تک رسا ہونے والی نظر حِس لمس کی بڑھی ہوئی ترنگ ہے اُسی طرح محبت، جنسی جبلت کی نمو یافتہ صورت ہے۔ سماج کو محبت کے مظاہر میں اپنے نیک قوانین کی سختی اور عوامی نفسیات کے توہماتی ظلم سے مزاحمت پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

حیات کی اعلیٰ ترین سطحوں میں جنسی اُصول دوسرے سے کسی نہ کسی نوع سے متعلق رہتا ہے۔ جوں جوں ہم اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں یہ اُصول ایک نصب العین کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ عقل اُس میں ترمیم کرکے اُسے قابو میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔ بُرے بھلے کی تمیز ہیجان اور فعل میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ تعصب اُس جذبہ کو نرم بنا دیتا ہے اور نظر میں جمالیاتی

زنگ آجاتا ہے۔ نظری طور پر ارادہ جنسی فعل پر چھا جاتا ہے اور اسی حد تک خواہش پر بھی قابو حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن نظریات خس و خاشاک ہیں جو کسی سیلاب کو روک نہیں سکتے۔ جذبات کے تحت جنسی تعلقات سنگین مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ جذبۂ محبت قانون کے فیصلوں اور مذہب کے سحر طرازیوں یا جسمانی مزاحمتوں سے اپنے بہاؤ کے رُخ کو کبھی نہیں بدلتا۔ واقعی محبت ایک ہمہ صورت مظہر یا کئی مظاہر کا مجموعہ ہے۔ وہ دینیاتی اور تقریری حدود میں گھٹ کر رہ نہیں سکتی۔

جوشِ محبت میں جنسی عفت محض ایک نقطۂ نظر ہے۔ اس کا تعین مرد و عورت کے باہمی جذبات پر منحصر ہے نہ کہ ملت کی مداخلت پر۔ محبت کے گمراہ کن حقوق کے مقابلے میں ہی نیک و بد کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دہری اور مذہبی آئین و ضوابط کی تدوین ہماری روش کی رہنمائی اور ہمارے انفرادی حقوق کی حفاظت کے لئے ہوئی ہے۔ ان ضوابط کا اطلاق ہماری املاک اور شخصی اور سماجی حقوق پر ہوتا ہے۔ لیکن اس دفتر میں بہت سے قوانین مردہ ہو چکے ہیں کیونکہ وہ صرف نظری ہیں اور روزانہ زندگی کے واقعات سے میل نہیں کھاتے۔ کوئی موثر قانون

جذبات اور افکار کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ ہماری جہالت نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا ہے۔ اب لوگوں کے خیالات کو روشن کرنے کی ضرورت ہے۔ فکر کے جذبے اور شخصی کردار کو زیادہ سے زیادہ روحانی اور تعلیمی روشنی اور کم سے کم دباؤ سے ہموار بنانا چاہیئے۔

شخصیت کئی منظم عناصر سے مرکب ہوتی ہے۔ اُس کی تہہ میں جنسی جبلّت ہوتی ہے اور اُس کی چوٹی پر محبت کھلتی ہے۔ ان کے درمیان آب حیات بہتا ہے۔ جنسی فعل حادثہ کے روپ میں اپنا کام کرتا ہے۔ نظری طور پر ارادہ بہت بڑی چیز ہے کیوں کہ اُس کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے جو بلاواسطہ اور بالواسطہ تجربے کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ ارادہ احساس عدل سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے اور احساس عدل کو ضمیر سے قوت پہنچتی ہے۔ لیکن عملی طور یہ ساری بنیادیں ریت پر ہوتی ہیں۔ ضمیر ایک پختہ عادت کا نام ہے جو ممکن ہے کہ بے اثر ثابت ہو۔

پھر کس طرح شخصی کردار کو اجتماعی جذبات کے ساتھ ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے؟ محبت کے اصلی قوانین کے بغیر محبت میں جنسیت پر کس طرح قابو حاصل کیا جا سکتا ہے خواہ یہ خواتین کتنے ہی شہوانی

ہوں؟ یہ سچ ہے کہ ان قوانین سے عام کلیے بڑی خوبی کے ساتھ اخذ کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ تعمیم صرف اتفاقی طور پر ہو جاتی ہے اگرچہ کہ حسن تعمیم آسمان کی طرح سب پر چھایا ہوا رہتا ہے۔
جنسیت ہماری شریف تر ضرورتوں سے وابستہ ہونے کی وجہ، مکمل مرد و عورت کی محبت کا نام ہے۔ کوئی روایت، کوئی خوف حتیٰ کہ موت بھی اس کو مسخر نہیں کر سکتے۔ زاہد طعنہ زن ہوں یا میزان عدل گرج اٹھیں یا پرانے دقیانوسی اپنی خفگی کا اظہار کریں یہ عطیۂ الٰہی جو انسانیت کو خباثت، بربریت اور درندگی سے نجات دلاتا ہے، سیلاب اور آندھی کی طرح اپنا راستہ آپ بناتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ انسانوں کے یہ اعلیٰ مطالبات جو محبت کے شاندار اور محیر العقول مسائل پیدا کر لیتے ہیں، اصلی مظاہر ہیں اور ہمیں ایسا ہی سمجھنا چاہیئے۔ ان حقائق کو روایت یا بنے بنائے ضمیر کی نفرت سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ محبت کے کیف و نشاط کو نوع انسانی کے بہترین دماغوں نے فنون لطیفہ میں غیر فانی بنانے کی کوشش کی ہے۔ محبت کے بغیر المیہ کا تصور ناممکن ہے۔
یہ نشاط انگیز خواب ایک ایسی جنسیت کا نظارہ کراتا ہے

جو بہت قدیم ہے۔ یہیں ہماری نظریں گذرے ہوئے زمانوں کے معنی سے روشن ہو سکتی ہیں۔ ایک انداز، ایک تبسّم، ایک آنسو، ایک آہ، ایک بات، ایک شرمیلی ادا، جسم کا سڈول پن، دانتوں کی چمک دمک، یہ سب چیزیں ہماری شاعری کے لئے طاقت اور لطافت کا سرچشمہ ہیں۔ یہ جذبات انسانی شعور کی طوفانی موج پر گیت بن کر ناچ رہے ہیں۔ محبت کی اس دُنیا میں مُرجھائے ہوئے پھول کی خشک پتی بھی خوشگوار یادوں سے شاداب نظر آتی ہے۔ ایک ٹھکرایا ہوا رومال بھی اپنی شخصیت سے مالامال دکھائی دیتا ہے۔ یہیں ایک لمس پھیلتا ہے اور ساری فضا کو اپنے وجود سے معمور کر دیتا ہے۔ یہیں ایک بوسہ زینۂ فردوس بنتا ہے اور جنسی معانقہ زمینی تمناؤں کو جنت کے خوابوں سے بدل کر انھیں حقیقت بنا دیتا ہے۔ یہ چیزیں کچھ نہیں ہیں اور سب کچھ ہیں۔۔۔۔ مزاحمتوں اور مشکلات سے بالا اور بے نیاز

محبت ایک اشرف انسان کے لئے معمور بادلوں کا سمندر ہے ہر آن متغیر اور ہر آن ٹھہرا ہوا۔ وہ ہماری امنگوں سے حرکت میں آتا ہے۔۔۔ جو درد کی طرح مبہم ہوتی ہیں اور اُمید کی طرح حسین۔ وہ ایسی ہواؤں سے لہراتا ہے جو دکھائی

نہیں دیتیں لیکن محسوس ہوتی ہیں۔ اس کی جذبانیت، لامحدودیت کی رُوح سے کیف حاصل کرتی ہے۔ محبت کا ہر معانقہ زندگی کا ایک نیا رُخ ہے، شعور کا نیا ارتقاع ہے، زندگی کا تازہ الہام ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر محبت ہماری روایات کے زندانوں سے سر نکال کر کسی کا منہ چوم لے۔ کیا ہم ایسے موقع پر اپنے لچر پوچ قوانین سے رُوح کی ربانیت، شاعری کی لطافت اور زندگی کے جوہر کو تباہ کر دینگے؟ کیا ہم ایسا کر بھی سکتے ہیں؟

سماج نے زناکاری کو ناگزیر بنا دیا ہے (فطرت انسانی کے مدنظر) سماج کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنی وحدتوں کو اپنے اجتماعی قصوروں کی بنا پر سزا دے۔ سماج تعزیری کارروائیوں کے ذریعہ زنا کا قلع قمع نہیں کر سکتی۔ البتہ وہ اس کے وجود کو غیر ضروری بنا سکتی ہے، اگر ازدواج کو فوق فطرت اُلجھنوں اور توہمات سے نکال کر اُسے ایک دہری ادارہ بنا دیا جائے (جس میں معقول لچک ہو) اور وہ ایک یا دونوں فریق کی مرضی سے ساری نمائشوں سے پاک بھی ہو۔ دوسروں کے حقوق کی حفاظت (جیسے بچے) کا سوال لائق غور ہے نہ مشکل "حقیقی ازدواج زنا کو ناممکن بنا دیتا ہے۔"

فحاشی

ہماری سماجی زندگی کے مظاہر پر اظہار خیال کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو انھیں چھیڑا نہ جائے اور اعتراف کر لیا جائے کہ ہمارے موجودہ تمدن میں اخلاقیات اور عقلیات جیسے بھی ہیں، ہیں۔ یا جرأت کے ساتھ ہر زاویہ نظر سے اُن کی جانچ کی جائے اور نتائج کی پروا نہ کی جائے۔

ایسے مظاہر میں ایک پیشہ ورانہ زنا کاری یا فحاشی نہایت اہم ہے۔ ہم جب تک ایک کیمیائی یا طبیعاتی مسئلے یا ایک

وبائی مرض کی طرح اُس کی تنقیح نہیں کریں گے، ہمارے نتائج ناقص اور ہماری تحقیقات عبث ہوں گی۔

بہت کم لوگ مذہبی، اخلاقی اور جذباتی عصبیت کے بغیر اس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ اگر آپ اس بیان کی صداقت پر یقین کرنا چاہتے ہیں تو کسی شخص سے بھی یہ پوچھ بیٹھئے کہ کیا فحاشی ایک برائی ہے؟ اس کا چہرہ غصہ سے فوراً لال ہو جائے گا۔ کیوں کہ وہ فحاشی کو مسلمہ طور پر ایک خطرناک برائی سمجھتا ہے اور اس قسم کا سوال اس کے نزدیک نہ صرف مہمل ہے بلکہ عین بداخلاقی اور بدروشی پر دلالت کرتا ہے۔ تقریباً وہ سب جو فحاشی پر بحث کرتے ہیں، اُسے مٹا دینے، اُسے محدود کر دینے، اُس کی تنظیم کرنے، اُسے تعزیرات میں جکڑ لینے اور مختلف طریقوں سے اُس کے اثر و نفوذ کو گھٹا دینے پر غور کرتے ہیں لیکن وہ ایک ناگزیر بُرائی ہے اور اُس پر حیص بیص کی ضرورت ہی نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ فحاشی ایک برائی نہیں ہے۔ غالباً ہم آئندہ صفحات میں اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ فحاشی کبھی نہ کم ہونے والی بُرائی ہے جس سے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ ہم ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کریں گے کہ اُس میں کچھ خوبیاں بھی پائی

جاتی ہیں جو برائیوں سے زیادہ ہیں۔ غالباً ہمارا تیسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ایسی صورت میں برائی نہیں بن سکتی۔ اُسے ہمارے احمقانہ اور حیوانی نقطۂ نظر نے برائی بنا دیا ہے۔ غالباً ہمارا چوتھا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُسے کسی نہ کسی طرح کچل دیا جائے۔ آخر کار ہمارا فیصلہ یہ ہوگا کہ اُس کا کچل دینا ممکن بھی ہو تو اُس کے وجود سے زیادہ خطرناک اور مُضر اُس کی موت ہوگی۔ مختصر یہ کہ ہم اس مسئلہ کی تحقیقات پر آمادہ اور اپنے نتائج پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن ایک عام انسان کے لئے یہ ایک آخری چارہ کار ہی۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں فحاشی کی پوری تفصیلات پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے تاہم اُس کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور اہم نقاط کو بیان کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم عقل و انسانیت سے کام لے کر خامہ فرسائی کریں۔ بابل کی مندری فحاشی قدیم روم کے لوُپناری خدام کی کمائی، عہد وسطیٰ میں بیسواؤں کی خاص پوشاک اور اسی قسم کے بیسیوں قصے نہایت دلچسپ ہیں مگر وہ ہماری معاشرتی برائی کے مسئلہ کو حل

مرد، بیسواؤں کی سرپرستی کیوں کرتے ہیں اور عورتیں اس قدیم ترین پیشے کی کراہتوں اور بُرے عواقب کے باوجود، اس سے کیوں چمٹی ہوئی ہیں؟ مضمون کا یہ حصہ نہایت اہم ہے ہم اُس کے اسباب کو معلوم کرنے کے بعد ہی رائے قائم کرسکتے ہیں کہ فحاشی کو آیا مٹایا جاسکتا ہے اور اُس کا مٹا دینا مناسب ہے یا نہیں۔

اب ہم معلوم کریں گے کہ فاحشہ کی تعریف کیا ہے۔ دنیا میں کسی طبقے کے متعلق اس قدر مہمل بکواس اور پوچ خامہ فرسائی سے کام نہیں کیا گیا جتنا کہ "انسانیت کی لافانی دیوی کو لوگوں کے گناہوں کی وجہ لتھاڑا گیا ہے"۔ گو پیش قیاسیاں خطرناک ہیں، لیکن ہم فحاشی کے مستقبل پر اُس کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ قرائن سے مدد لے کر اپنی رائے کا اظہار کرسکتے ہیں۔

فحاشی کا اصل سبب کیا ہے؟ کیوں عورتیں اس میں مبتلا ہیں؟ اور کیوں مرد اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ان تینوں سوالات کا جواب ایک سہ حرفی لفظ "جنس" کے ذریعہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس جواب سے کسی قسم کا گریز مقصود نہیں ہے بلکہ وہ بالکل صحیح اور سب چیزوں پر حاوی ہے۔ جنس کو

الگ کر دیجیے، فحاشی اور مسئلہ فحاشی دونوں ختم ہو جائیں گے۔
لیکن چونکہ جنس کی موت نسل انسانی کی موت ہے، اس لیے ہم ایک دوسرے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں گے اور اُس کی مختلف صورتیں معلوم کریں گے۔

اس عام سوال کو کہ "فحاشی کا سبب کیا ہے؟" اُوپر دیا ہوا جواب "جنس" مشتفی کر سکتا ہے اور وہ درست بھی ہے فحاشی کے بنیادی وجوہ جنسی جبلت اور اس کی ناگزیر تشفی ہیں۔ لیکن یہ وجوہ کہ کیوں مرد و عورت جنسی تشفی کی اس خاص صورت کو پسند کرتے ہیں، توضیح طلب ہے۔

عورتیں فحاشی میں کیوں مبتلا ہیں؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں۔ خاص طور پر معاشی عنصر پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لیکن ایک جواب کی حیرت انگیز طور پر کمی پائی جاتی ہے۔ وہ جواب یہ ہے: بعض عورتیں فحاشی میں اس لئے مبتلا ہیں کہ وہ اس پیشے سے محبت رکھتی ہیں وہ اسے اس قدر چاہتی ہیں اُس کے کسی عظیم ترین بدل کو بھی وہ قبول کرنے تیار نہیں ہیں۔ ان کی جنسیت بہت قوی ہے اور ان میں سے بعض اپنے تجربہ کی بناء پر جانتی ہیں کہ کوئی شخص ان کی سیری نہیں کر سکتا اور اگر ایسا کوئی دیکھ

انھیں مل بھی جائے تو وہ اُس پر قانع نہیں ہو سکتیں کیوں کہ وہ تنوع پسند ہیں اور ہر وقت نئے رفیق کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ایک عیسائی لڑکی نے کہا تھا کہ وہ اپنے بیسوا پن کے معاوضے میں ملکۂ انگلستان کا منصب بھی قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اگر اپنا پیشہ ترک کر دے تو اس کی سیری کے لئے روزانہ ۵ سے ۱۰ تک مختلف نوجوان کہاں سے آئیں گے؟ ہمیں ایسی عورتوں کا بھی علم ہے جو روزانہ ۲۰ سے ۳۰ تک مردوں سے اپنی آگ بجھاتی ہیں۔ یہ خالص قسم کی فاحشات کہلاتی ہیں۔ وہ فحاشی میں فحاشی کی خاطر مبتلا ہوتی ہیں اور ان کے پاس اتنا اندوختہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس شوق کو ترک کر کے راحت و عزت کے ساتھ زندگی بسر کریں، لیکن وہ اپنے شوق سے باز نہیں آتیں۔ ان میں غیر معمولی شہوت پرست عورتیں بھی ہوتی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ باقی سب جنسیت زدہ ہوتی ہیں۔ جس طرح ہر جنسیت زدہ عورت شہوت پرست نہیں ہوتی اسی طرح ہر جنسیت زدہ مرد لازمی طور پر شہوت پرست نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ان عورتوں پر مشتمل ہے جنہیں اپنی جنسی تحریک کی تشفی کے لئے چکلے سے بہتر کوئی مقام نہیں ملتا یعنی وہ بدنصیب

عورتیں ہیں جنھیں کوئی بَر یا کوئی عاشق میسر نہ آسکا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن عورتوں کو شادی کا موقع نہیں ملا یا انھیں کوئی آشنا دستیاب نہ ہو سکا، وہ سب فحاشی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر متمدن ملک میں دوشیزہ بوڑھی خادمات کی اتنی کثرت نہ ہوتی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بہت سی مجرد عورتیں فحاشی اور ماحولی عناصر سے مجبور ہو کر فحاشی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ بیان کردہ پہلی قسم کی عورتوں میں جنسی جبلت مقتدرِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ماحول کے بُرے اثرات اور معاشی حالات محض ضمنی عناصر ہیں۔

نسوانی فحاشی کا دوسرا سبب ہم جنسیت ہے۔ بہت سی عورتیں اس لئے کوٹھے چڑھتی ہیں کہ وہاں اپنی لزبیانی تحریک کی تسکین کی جا سکے۔ عام رائے اور بعض ماہرانِ جنسی کی رائے کے خلاف ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم جنسیت کا شوق مردوں سے زیادہ عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی عام وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عورتوں کو بوس و کنار اتنا مشتعل نہیں کرتے جتنا کہ مردوں کو۔ اس کے علاوہ نسوانی ہم جنسیت کے انسداد کے لئے کسی ملک میں کوئی قانون نافذ نہیں ہے اور ایسے اسرار طشت از بام

بھی ہونے نہیں پاتے۔ پھر یہ کہ ہم جنسی عورتیں جماعی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی رہتی ہیں اور اس طرح اُن کی حقیقی جنسی حالت چھپی ہوئی رہتی ہے۔ عورت کے مقابلے میں ہم جنسی مرد کے لئے زناشوئی تعلقات کا نبھانا دشوار ہے۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔ مردوں سے زیادہ عورتیں دو جنسی ہوتی ہیں۔ اس لئے جماع انھیں ناگوار نہیں گذرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مفعول ہوتی ہیں اور آسانی سے اپنی بے زاری کو چھپا سکتی ہیں۔ ہم جنسی مرد کے لئے مباشرت کی ناگواری سے قطع نظر جسمانی طور پر جماعی تعلقات کا نبھانا مشکل ہوتا ہے۔

اب ہم فحاشی کے معاشی سبب کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ خراب معاشی ماحول، بدترین افلاس، غذا، لباس اور گھر کے فقدان سے عورت راست طور پر فحاشی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس عنصر کی اہمیت جتانے میں غلو سے کام نہ لینا چاہئے۔ یہ واقعہ ہے کہ فاحشات میں زیادہ تر خادمات اور باقی معزز گھرانوں کی عورتیں ہوتی ہیں، بھوک اور نگھرے پن کو فحاشی کی وجہ قرار نہیں دیتا۔

ہمیں ایک لڑکی کا ذاتی علم ہے کہ وہ اپنے ولدالزنا کی پرورش کی خاطر فحاشی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ اُسے یتیم خانہ میں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود اس کی پرورش کرنا چاہتی تھی اور جانتی تھی کہ اس کی کیا خوبیاں ہیں۔ اُسے کوئی ایسا کام بھی نہ مل سکا جس سے اس کی اور بچے کی گذر بسر ہو سکے۔

ایک اور عورت جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہو گی اپنی بہن کے تین یتیم بچوں کو پرورش کرنے کی خاطر فاحشہ بن گئی تھی اُس کی کمائی خاصی تھی اور اُن بچوں کو دوسرے مقام پر رکھ کر تعلیم و تربیت کے مصارف برداشت کرتی تھی۔ یہاں افلاس سے زیادہ یہ وجہ قوی ہے کہ وہ تین بچوں کی نگہداشت کرنا چاہتی تھی اُسے اپنی فکر نہ تھی۔ وہ ایک دختر کلیا تھی اور سمجھتی تھی کہ اُس کے گناہ محض اس لئے بخشے جائیں گے کہ اُن گناہوں کی مزدوری اچھے کام میں صرف کی گئی تھی۔ یہ ایک گناہ کبیرہ ہوتا کہ اُس کی متوفیہ بہن کے بچے در در پھرتے اور آوارہ ہو جاتے۔

گو مفلسی فحاشی کا ایک سبب ہے لیکن اکثر اوقات

یہ مفلسی نہیں ہوتی بلکہ اُس کے بجائے تن آسانی، مادی راحت اور خدمت گذاری کی کھکھیڑوں سے آزادی کی خواہش ہوتی ہے۔ جو شادی شدہ معزز خاتون کبھی کبھار شوقیہ طور پر فحاشی میں مبتلا ہو جاتی ہیں وہ کوئی غیر معمولی طور پر جنسیت زدہ نہیں ہوتی مگر اُس کا شوہر نامرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر سے محبت کا اظہار بھی کرتی ہے اور نہیں چاہتی کہ محض بے اولادی کے باعث اُسے کوئی دُکھ پہنچائے یا ازدواجی تعلقات منقطع کردے۔ وہ بعض اوقات فحش کاری میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس طریقے کو عشق و محبت کی رسوائی سے کم خطرناک سمجھتی ہے۔ ایسی خواتین ان فحش کاریوں کا معاوضہ لینے سے انکار تو نہیں کرتیں لیکن زر و سیم ان کا مطمح نظر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طبقے کی دولت مند خاتون خود اپنے عیش کی قیمت ادا کرنے پر مائل رہتی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہمارے اکثر اعمال میں متعدد اور پیچیدہ نیات کام کرتی رہتی ہیں۔

شوقیہ فحش کاری کا عام سبب مرد کا جسمانی انحطاط اور غیر متشفی جنسی زندگی ہے۔ یہ جسمانی کمزوری، خراب غذا، شراب، تمباکو، عام خرابی صحت، جنسی معلومات کی کمی، جنسی انحرافات

امراض خبیثہ، کمزور جنسی فعل، سُرعت انزال سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر آسودہ ازدواجات اور اُن کے عواقب بھی، شوقیہ فحاشی کے قوی اسباب میں شمار ہوتے ہیں جسے ہماری سماج تجاہل عارفانہ کے ساتھ گوارا کئے جا رہی ہے۔

فحاشی کے دیگر اسباب غیر اہم ہیں۔ بعض عورتیں بچپن ہی سے چکلے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ اسی ماحول میں آنکھ کھولتی ہیں یا ماں بہنوں کو فحاشی میں مبتلا دیکھ کر ان کی آنکھ کا پانی مر جاتا ہے اور بالغ ہونے سے پہلے ہی یعنی ۱۲، ۱۳ سال کی عمر سے اُن کے کاروبار شروع ہو جاتے ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ خود ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو اس روزگار سے لگا دیا تاکہ جلب منفعت ہو، اغوا اور ترک یا اغوا کے بعد ایک جعلی یا حقیقی شادی اور پھر بہائم صفت مردوں کا فحاشی کا پیشہ اختیار کرنے پر جبر و ظلم بھی کبھی کبھی فحاشی کے بلاواسطہ باعث بن جاتے ہیں۔ کمزور ارادہ بزدلی اور جہالت بھی بعض عورتوں کو بے رحم انسانوں کے چنگل میں پھنسا دیتی ہیں اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر اُن کی غلامانہ اطاعت پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ کبھی کوئی لڑکی غلط قدم اٹھانے پر اپنے ماں باپ، رشتے دار اور احباب کی شفقتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور

وہ معاشی مصیبت اور روحانی یاس کی شدت میں خودکشی کرلیتی ہے یا چکلے کا راستہ لیتی ہے۔ کبھی کوئی لڑکی اپنے گھر کے افلاس سے متاثر ہوکر اور یہ دیکھ کر کہ اُس کے بھائی بہن کھانے اور کپڑے کے محتاج ہیں اور اس تنگدستی کو رفع کرنے کی کوئی جائز صورت بھی نظر نہیں آتی، اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر کسی شہر کا رُخ کرتی ہے اور عصمت فروشی کے ذریعہ اپنے کنبے کی مدد کرتی رہتی تاکہ اُس کے بھائی بہن کو زندگی میں کوئی موقع مل سکے۔

مختصر یہ کہ عورتیں فحاشی کو اپنے جنسی ہیجان کی تشفی کا واحد ذریعہ سمجھتی ہیں۔ بعض عورتیں غریبی سے تنگ آکر اُسے اختیار کرلیتی ہیں۔ لیکن غریبی کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جیسے عدم تربیت اور گھر کی سقیم حالت وغیرہ اس میں داخل ہیں۔ یہاں صفت والدین یا بے وفا اور نیم مرد شوہر، بُرے نمونے، طعنے اور مردوں کے تعیشات لایعنی بھی عورت کی نفسیات پر بُرا اثر ڈالتے ہیں اور وہ ان سے بیزار ہوکر فحاشی کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ بعض عورتیں دوسرے پیشوں سے مایوس ہوکر روپیہ جوڑنے کی خاطر یہ پیشہ اختیار کرلیتی ہیں مگر شادی کے ذریعہ تاکہ ماں باپ کے گھر سے خوب

جہیز ملے اور وہ سماج کے جھوٹے معیارات پر پوری اُتر کر معزز زندگی بسر کریں۔ یہ عارضی فاحشات ہوتی ہیں جن کا مقام اتفاقی اور مستقل فاحشات کے درمیان ہوتا ہے۔

بہت سے مرد بھی یہی کرتے ہیں۔ اُن کی جنسی جبلت پندرھویں سال تک بیدار ہو جاتی ہے مگر بہت کم ۲۵ سال سے پہلے شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ بہت سے کاروباری لوگ ۳۰ سال سے پہلے متاہل نہیں ہو سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ اس درمیانی زمانے کو کس طرح کاٹیں جس میں جنسی تحریک پورے شباب پر ہوتی ہے۔ کامل پرہیزگاری؟ بہت کم اس کے پابند ہو سکتے ہیں۔ جلق؟ بہت سے اس ناقابل اطمینان بدل میں مبتلا ہیں اور بعض اوقات ناقابل تلافی نقصان بھی برداشت کرتے ہیں۔ کسی شادی شدہ خاتون سے دوستی؟ اس کا بھی بہت کم امکان ہے۔ اس لئے ساری متمدن جماعتوں کے نوجوانوں کی اکثریت اپنی خالص جسمانی جنسی خواہش کی تسکین کی خاطر قحبہ خانوں میں جاتی ہے۔ "خالص جسمانی جنسی خواہش" کا اطلاق صرف چند نوجوانوں پر ہوتا ہے۔ بعض نوجوان قحبہ خانوں میں جنسی خواہشات کی تکمیل کے ساتھ کچھ اور بھی

چاہتے ہیں۔ وہ رومان، شعریت، بوس و کنار، اُلفت اور "محبت" کے طالب بن کر کوٹھے چڑھتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں وہاں کہاں۔ وہاں سارا کھوٹ ہی کھوٹ ہے۔ وہاں معیاری زر نایاب ہے۔ وہ کسی بدل کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر تشفی نہیں ہوتی۔ تاہم کچھ نہ کچھ تشفی عدم تشفی سے بہتر ہے۔ یہ کہنا بھی زیادہ صحیح نہیں ہے کہ فاحشہ اور اُس کے گاہک میں کوئی اُنس و ہمدردی نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ گاہک کے دل میں خالص اُلفت کا جذبہ لہرا رہا ہو اور فاحشہ کی نفسیات بھی تجارتی اغراض سے پاک ہو (ہمیشہ نہ سہی مگر کبھی کبھی ضرور) حسن فروشی خالص محبت کے امکان کو لازمی طور پر کم نہیں کر دیتی۔ کیا ہمیں یہ یقین ہے کہ ہر صورت میں خالص محبت بے لوث ہوتی ہے؟ کیا وہ محصلہ اور متوقع منفعتوں سے بے داغ ہوتی ہے؟

قحبہ خانوں اور انفرادی فاحشات کا دعویٰ ہے کہ اُن کے گاہکوں کی نصف تعداد متاہل مردوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اُن کا صحیح فی صد تو غالباً کبھی معلوم نہ ہو سکے گا لیکن ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ مذکورہ تخمینہ صحت کے قریب ہے

ماہران امراض خبیثہ کہہ سکیں گے کہ متاہل مریضوں کی فوج کافی بڑی ہے۔ متاہل مردکیوں فحاشی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟ اُن کی حد تک خالص جنسی ضرورت کی تکمیل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سوال اور اُن سارے سوالات کا جواب جو فحاشی سے متعلق کئے جائیں بے باک اور واضح ہونا چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی تلخ ہو۔ فحاشی کو متاہل مردوں کی سرپرستی اس وجہ سے حاصل ہے کہ مرد فطری طور پر متعدد زوجی واقع ہوا ہے گوکہ یہ نظریہ مختلف فیہ ہے۔ اُس کی حیوانی جنسی جبلّت تنوع اور آزاد جنسی تعلقات کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس بیان کی صحت میں رمق برابر شبہ نہیں ہے۔

اکثر لوگ رسم و رواج، مذہب، اخلاقی قوانین اور سماجی دباؤ کے سہارے اس حیوانی جبلّت کو دبا دیتے ہیں اور انھیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ کبھی اس کا وجود بھی تھا۔ دوسرے اُس کے وجود کا احساس رکھتے ہوئے اس پر قابو پا سکتے ہیں۔ مگر بعض اُس کی مدافعت نہیں کر سکتے۔ یہی لوگ فاحشہ پرست ہوتے ہیں۔ بعض مرد یک زوجی یکسانیت سے اُکتا جاتے ہیں۔ خصوصاً غیر آسودہ شادیاں اور ناموزوں

بیویاں اُنھیں زندگی سے مایوس کر دیتی ہیں۔ اُن کی شہوت اور مردمی دونوں گم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہی مرد دوسری عورتوں سے رجوع ہوتے وقت ایسی کوئی کمزوری محسوس نہیں کرتے۔

یہاں ہم ایک دلچسپ اور اہم تجربے کا ذکر کرتے ہیں جس کے متعلق کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں ہے۔ بعض مرد جو اپنی بیویوں سے صحبت کی خواہش کھو بیٹھیں اور جسمانی اور نفسیاتی طور پر اُن سے کسی ربط کے اہل نہ رہیں؛ دوسری عورتوں کے ساتھ جنسی روابط قائم ہوتے ہی اپنی گم شدہ مردمی اور توانائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح فاحشہ قانونی بیوی کی حقیقی خدمت کرتی ہے۔ وہ اکثر یک زوجی شادی کو گوارا بناتی رہتی ہے اور خاندان کی کاملیت میں فصل پیدا کرنے کے بجائے وصل کی موجب بنتی ہے۔ ہمارے سماجی اخلاقی قوانین کے بعض نقاد کی رائے میں جبری یک زوجی شادی ہی فحاشی کا کلیدی سبب ہے۔ ہماری رائے میں اُسے اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ مگر دیگر اسباب میں سے ایک سبب ضرور ہے۔

فاحشات کی سرپرستی کے غیر اہم وجوہ میں سے ایک وجہ

ضبط تولید کی خواہش ہے۔ بہت سے خاندان ضبط تولید کے اُصول اور طریقوں سے ناواقف ہیں، اس لئے کثرت اولاد سے بچنے کے لئے مرد اپنی جنسی ضرورتوں کی تکمیل گھر سے باہر کسی جگہ کر لیتا ہے۔ عموماً اپنی بیوی کی مرضی سے اور بعض وقت اس کے اصرار سے مجبور ہو کر۔ ہمیں ذاتی طور پر ایسے حالات کا علم حاصل ہے۔

دوسری وجہ بیوی کی خرابیٔ صحت ہے۔ قلبی امراض اور مرض خنزیر میں جنسی تعلقات بے کیف اور مرد کے لئے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان حالات میں بعض بیویاں مرد کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ باہر کہیں اپنی ضرورت پورا کرے۔

ہم نے اس حصّہ کے پہلے فقرے میں بیان کر دیا ہے کہ بہت سے مرد بالغ ہونے کے بعد غیر متاہل رہتے ہیں اور اس لئے وہ فحاشی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، بعض مرد موزوں رفیقہ کی کمیابی اور معاشی بے بسی کی وجہ عمر بھر کنوارے رہتے ہیں لیکن ایسے مردوں کی تعداد بھی کافی ہے جو دولت مند ہونے، عورتوں سے محبت کرنے اور دل کو مسخر کرنے والی محبوبہ کو پانے کے باوجود، شادی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ایک مستقل اور ناقابلِ تحلیل

اتحاد کے تصوّر سے گھبرا اُٹھتے ہیں۔ اُنھیں قیام خاندان کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ وہ بچّوں کی ذمہ داری کو برداشت نہیں کرسکتے۔ تناسلی جبلّت اُن کے نزدیک خرافات سے کم نہیں۔

ہم اب یا آئندہ کوئی اخلاقی فیصلہ صادر کرنا نہیں چاہتے اس مقالے میں محض واقعات کا اظہار کیا جارہا ہے۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے اور بعض اُسے افسوسناک بھی تصوّر کریں گے کہ بہت سے مرد فاحشہ سے فاحشہ پن کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ وہ اُس کے پھوہڑ، گنوار، اور مبتذل اداؤں سے محبت کرتے ہیں اور جس قدر یہ خصوصیات شدید ہوں گی، اُسی قدر وہ اُس کی طرف کھچتے جاتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان عجیب و غریب مردوں میں عموماً تعلیم یافتہ اور صاحبِ ذوق پائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اُجڈ اور گنوار مرد نازک اندام اور مہذب قسم کی عورت کو پسند کرلیتے ہیں۔ شاعر اور رومانی نوجوان ناتراشیدہ اور نامہذب فاحشہ کا گرویدہ ہوتا ہے جو صرف نسوانیت کا مجسمہ ہو۔ ممکن ہے کہ اس فطرت کا مرد اپنی شکیل و جمیل بیوی کا پرستار ہو اور اُس کے سر کا ایک بال بھی زمین پر گرنے نہ دیتا ہو مگر اُس کے باوجود وہ کبھی کبھی

اپنی جدّی (حیوانی) جبلّت کی تسکین ایک ایسی عورت کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے جو لائق نفرت ہوتی ہے

یہ دوسرا واقعہ پہلے سے زیادہ عجیب ہے۔ بعض مرد فاحشات کے سوا کسی سے جنسی تعلق قائم کر سکتے ہیں نہ اُس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ اس کی صرف یہ وجہ نہیں ہے کہ ایسی عورتیں فن مباشرت میں طاق ہوتی ہیں اور معزز خواتین کوری رہتی ہیں۔ وہ اُن سے جنسی روابط قائم رکھ کر تہیج بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض مرد فاحشات سے کوئی جنسی تعلق پیدا نہیں کر سکتے۔ اُن کا منہ پھیر دینے کے لئے اِتنی بدبُو کافی ہے کہ اُن سے پہلے بہت سے مرد کسی فاحشہ کو بھنبھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ بہر حال مردوں کے جنسی ذوق مختلف ہوتے ہیں اور عجیب تر بات یہ ہے کہ ہماری سماج میں سب انسانوں کے لئے یکساں آہنیں قوانین مرتّب کئے جاتے ہیں۔

بعض مرد کسی موروثی بیماری، مثلاً مرگی خلل دماغ وغیرہ کے سبب شادی نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے بچّوں میں اس بیماری کو منتقل کرنا نہیں چاہتے اور اُن کی ہونے والی رفیقہ اولاد کی خاطر ہی شادی کرنے پر مُصر ہے۔ اس طرح وہ عُمر بھر مجرد

رہتے ہیں۔ ایسے مردوں کے لئے کونسا چارہ کار ہے؟ فاحشہ اُن کی ضرورت کی تشفی کر سکتی ہے۔ اُسے ایسے مردوں کی موروثی بیماریوں سے کوئی گزند نہیں پہنچتا اور نہ کوئی داغدار اولاد اُن کے بطن سے پیدا ہو کر نسل کو متعفن کر سکتی ہے۔

بعض مرد بد قسمتی سے بدہیئت واقع ہوتے ہیں۔ کوزہ پشت، لنگڑے، لُولے اور اندھے کسی عورت کی محبت کو اُکسا نہیں سکتے۔ ایسے مرد تجرّد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور نوع کی فلاح کی خاطر اُن کا مجرّد رہنا ہی مناسب ہے۔ اُن کے لئے فاحشہ کا وجود باعث رحمت ہوتا ہے۔ اُس کے بغیر وہ ساری عمر کنوارے رہتے اور اُن کی زندگی بیجان سی ہو جاتی۔ یہ سوال ہماری بحث سے خارج ہے کہ مکروہ صورت مردوں کی جنسی ضرورتوں کے لئے عورتوں کی ایک جماعت تشکیل دی جائے۔ ہم صرف نظام فحاشی کی وہ خدمات گِنا رہے ہیں جن سے دنیا بھر کے مردوں کا نصف حصّہ (جس میں مختلف مزاج اور اُفتاد کے انسان شامل ہیں) بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ یہ حقائق اُس وقت ہمارے پیش نظر رہیں جب ہم اس نظام کو مٹا دینے پر بحث کرنے لگیں۔

جنسی کمزوری :- پہلی نظر میں یہ عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے یعنی مردوں کی جنسی کمزوری فحاشی کا سبب بن جائے؟ ہزاروں مرد فاحشات کے ہاں محض اس لئے جاتے ہیں کہ وہ جنسی طور پر کمزور ہیں۔ جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں کہیں بیان کر چکے ہیں کہ جنسی کمزوری سرعت انزال کی وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا شخص کسی طرح اپنی شہوت کھونے نہیں پاتا۔ بلکہ اُس میں کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے ۔ وہ جماع سے تسکین تو حاصل کرتا ہے مگر اپنے رفیق کو سیر نہیں کر سکتا. وہ شادی سے دو وجوہ کی بنا پر پرہیز کرتا ہے۔ وہ کسی لڑکی سے شادی نہ کرکے اپنی نظروں میں وقیع ہونا چاہتا ہے کہ اُس نے کسی کی زندگی تباہ نہیں کی۔ جہاں یہ اعلیٰ خیالی نہ پائی جائے وہاں یہ خوف جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اگر اس کی ہونے والی بیوی کی سیری نہ کی گئی تو وہ دوسرا ذریعہ اختیار کرے گی مرد کو فریب خوردگی اور دیوسیت سے نفرت ہے۔ یہ دوسرا خیال اُسے کسی عورت کو داشتہ کے طور پر استعمال کرنے سے بھی روکتا ہے۔ وہ معزز لڑکیوں دوستوں، اور آشناؤں سے کسی قسم کا تعلق قائم نہیں کر سکتا. کیوں کہ ایک معزز لڑکی یا خاتون اپنی

جنسی عنایات کے معاوضہ میں زر و سیم کے بجائے کم ازکم مکمل مردمی اور جنسی تشفی چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں ایسے مرد کے لئے ایک ہی راستہ کھلا ہوا ہے! فاحشہ۔ فاحشہ کے ساتھ وہ کسی قسم کا خوف اور ہراس محسوس نہیں کر سکتا۔ فاحشہ کی نظر میں اُس کی نامردی اور کمزوری کوئی اہمیت نہیں رکھتی (بلکہ وہ اکثر کمزوری کو ترجیح دیتی ہے) وہ کسی تصنع سے کام نہیں لیتی اور کوئی مطالبہ بھی نہیں کرتی۔ ہر فاحشہ بے تکلفی سے یہ بات بتا سکتی ہے کہ اُس کے گاہکوں میں نیم مرد اور نامرد ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ پورے نامرد (جن کی شہوت تک غائب ہو چکی ہو) لوگ ہی قحبہ خانوں کی زینت بنے رہتے ہیں۔ یہیں اُن کو کچھ نہ کچھ تشفی حاصل ہو سکتی ہے۔

مردمی کا غیر معمولی جوش:۔ فحاشی کا ایک سبب غیر طبعی مردمی ہے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے بعض مردوں میں مردمی کا غیر معمولی جوش پایا جاتا ہے۔ ایک عورت بیوی ہو یا داشتہ اُن کی سیری نہیں کر سکتی۔ اسی طرح شہوت پرست عورتوں کی بھی کوئی ایک آدمی سیری نہیں کر سکتا اگر بیوی معمولی طور پر یا معمول سے کم جنسیت رکھتی ہے تو، شوہر باہر

اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں اپنے آپ کو حق بہ جانب سمجھتا ہے۔ اُس کے لیئے آسان حل یہ ہے کہ وہ کسی فاحشہ یا قحبہ خانے سے رجوع ہو جائے جہاں وہ روک ٹوک اور اعتراض و احتجاج کے بغیر دل بھر کے اپنی مردمی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے بعض فاحشات جماع کے موقع پر کسی جوش کا اظہار نہیں کرتیں اور تکان محسوس کیئے بغیر کئی چوٹیں انگیز کر لیتی ہیں۔

جنسی انحرافات:۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں بعض مرد جنسی انحرافات کی طرف ہمیشہ مائل رہتے ہیں۔ ان کے بعض انحرافات تو عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ وہ قحبہ خانوں کی خاک اس لئے چھانتے ہیں کہ وہیں اُن کے انحرافات کی تشفی ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بعض کا کردار ایسا سقیم ہوتا ہے کہ صرف خرانٹ فاحشہ ہی گرانقدر معاوضہ پر اُن سے بھگت سکتی ہے۔ لیکن فحاشی کے یہ کاروبار ناجائز ہیں۔ یہ اُس کی قباحتیں یا زہریلی فاضلات ہیں جن کا شمار اُن عناصر میں نہیں ہو سکتا جو فحاشی کو ضروری معاشری مظہر قرار دیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنے تصورات کی

اصلاح کریں اور فاحشہ کو جسمانی انحطاط اور فطری اخلاقی کمزوریوں کا مجسمہ سمجھنا چھوڑ دیں۔ کوئی عورت پیدائشی فاحشہ نہیں ہوتی۔ خاص طور پر بیسواؤں کے طائفے کو اچھوت اور جرائم پیشہ قرار دینا بیوقوفی ہے۔ فاحشہ اور غیر فاحشہ دونو ایک ہی سطح سے ابھرے ہیں فاحشات میں اجڈ اور گنوار عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اور شائستہ شریف اور نرم دل بھی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ معزز خواتین میں بے ضمیر عورتیں پائی جاتی ہیں اسی طرح ان میں بھی یہ عنصر کہیں سے آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی فیاضی، ہمدردی اور غمخواری تو اتنی قابل قدر صفات ہیں کہ معزز خواتین کو ان کی تقلید کرنی چاہیئے۔ پھر وہ اپنے بوڑھے والدین اور غریب رشتہ داروں کی جس خلوص اور جوش کے ساتھ دستگیری کرتی ہیں وہ بعض عورتوں کے لئے نمونہ ہے جو اپنی عفت شعاری پر ناز کرتی ہیں اور فاحشہ کو ایسی حقیر مخلوق سمجھتی ہیں کہ نفرت سے اُس کا نام تک لینا نہیں چاہتیں۔

جب کبھی بیسوا کے بھاگوں کوئی بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کی نگہداشت میں وہ بیسیوں قربانیوں سے دریغ نہیں کرتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی وہ اُس کا گلہ گھونٹ ڈالتی ہے مگر اس خوف سے کہ وہ بڑا ہو کر اُن کا پیشہ نہ اختیار کر لے۔

یہاں تک بیسوا کی اخلاقی خوبیاں بیان کی گئیں۔ اُس کی ذہنی حالت کے متعلق یہ بکواس بالکل بے بنیاد ہے کہ وہ کم عقل ہوتی ہیں۔ وہ ایک اوسط عورت کی ذہنی اور تعلیمی سطح پر پائی جاتی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بیسواؤں کی اکثریت ناقص العقل ہوتی ہے تو اُن کا پیشہ ہی ان کیلئے اور نسل انسانی کے لئے خیر بر ترین ہے۔ کیا ہماری نوع کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ یہ لڑکیاں شادی کر کے عزت اور آبرو کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اپنے ذہنی نقص کو اپنے بچوں میں منتقل کر دیں؟ کیا یہ مناسب ہے؟ ہماری رائے میں تو ایسا سوال ہی اپنے جواب کا مترادف ہے۔ مگر بہت سے لوگ اس سے اتفاق نہ کر سکیں گے۔

اب ہم بیسوا کی عام جسمانی اور جنسی حالت پر غور کرینگے۔

بہت سے مخلص مصنفین نے بیسوا کو اخلاقی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے نہایت قابل رحم بلکہ لائق نفرت مخلوق بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیشہ اختیار کرنے کے بعد اس کی اوسط زندگی پانچ یا چھ سال ہوتی ہے وہ ہر قسم کا نشہ کرتی ہے۔ ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔ خاص طور پر

امراضِ خبیثہ میں چور رہتی ہے۔ ایک مصنف کہتا ہے کہ اس کا منھ پھولا ہوا اور اُس کا جسم گندہ اور کرم آلود ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان مکروہ مخلوقات کی سرپرستی کی جاتی ہے۔ صرف سماج کے ادنیٰ ترین طبقے کے لوگ شراب کے نشہ میں بدمست ہو کر ان سے رجوع ہو سکتے ہیں"۔

لیکن اس زمانے کی بیسوا اپنے جسم کی نگہداشت کرتی ہے، غذا اور حفظِ صحت کے اصول کی پابند رہتی ہے۔ مسکرات سے پرہیز کر کے بُرے دنوں کے لئے کچھ پس انداز بھی کر لیتی ہے۔ کیوں کہ اُن میں بعض بڑھاپے میں شادی کر کے معزز رنیوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں۔

جو لوگ فاحشات کی صد فی صد آبادی کو امراضِ خبیثہ میں مبتلا سمجھتے ہیں اور مہمل مبالغات سے کام لیتے ہیں، اُن کے خلاف ہم نے ہمیشہ احتجاج کیا ہے۔ جن فاحشات پر طبی نگرانی رکھی جاتی ہے ان میں مشکل سے دو فی صد ان امراض سے متاثر ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اخلاقی، ذہنی اور جسمانی اعتبار سے فاحشہ طبعی سطح پر ہوتی ہے جیسا کہ دوسری عورتیں ہوتی ہیں۔ وہ غیر طبعی، پست اور جرائم پیشہ نہیں ہوتی۔ ہم اب

اپنی بحث کے اہم ترین حصّے تک پہنچ چکے ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر فحاشی اور فاحشات کے متعلق کیا ہوگا؟ کیا فحاشی ایک مستقل ادارہ ہے جو ہمیشہ رہے گا یا ادلتے بدلتے حالات کے ساتھ یا سخت دباؤ کے تحت بالکل ختم ہو جائے گا؟ ہمیں آخری سوال کا سب سے پہلے جواب دینے دیجئے۔ یہ ہماری پکّی رائے ہے کہ فحاشی جب تک کہ نسل انسانی باقی ہے، کسی نہ کسی صورت میں باقی رہے گی تاوقتیکہ انسان بے لگام حقیقتوں کی طرف نہ پلٹ جائے اور اس کا امکان بہت کم ہے۔

ہمارے اس دعوے کی بنیاد اس پر نہیں ہے کہ چونکہ فحاش ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ جیسا کہ جنگجو قومیں حکم لگا دیتی ہیں کہ "جنگ ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی"۔ نہیں۔ جنگ ہمیشہ باقی نہیں رہے گی کیوں کہ وہ کسی حیاتیاتی جبلت کی تسکین نہیں ہے۔ مردم خوری، غلامی اور دیوتاؤں پر انسانی بھینٹ چڑھانے کی رسمیں، جادو ٹونے، طاعون، چیچک زرد بخار اور دیگر جسمانی، اخلاقی اور ذہنی خباثتیں ہمیشہ رہی ہیں مگر اب اُن کا وجود ختم ہوتا جارہا ہے۔ جو لوگ فحاشی کے مٹ جانے پر یقین رکھتے ہیں وہ ایسی ہی مثال دیتے ہیں جیسی کہ ہم نے پیش کی ہے۔

فحاشی ہماری ابتدائی جبلّتوں کی گھٹی میں پائی جاتی ہے اور اُسے دبا دینے کی ساری کوششیں از آدم تا این دم ناکام رہی ہیں۔ شریف عیسائیوں نے فاحشہ کو ترک پیشہ پر آمادہ کرنے کے لئے نہایت بے رحمانہ سزائیں دی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :۔ فاحشہ کو چوبی چوکھٹے میں کھڑی کر کے نمائش کی گئی۔ اُسے خاص لباس اور خاص تحقیری نشان استعمال کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر چٹان کی چوٹی پر سے ندی میں پھینک دیا گیا اور غوطے دیئے گئے۔ سر کے بال جلا دیئے گئے اور جسمانی سزائیں جیسے پھانسی، سر کٹائی وغیرہ سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ ان کے علاوہ عام نفرت اور سماجی مقاطعہ کے ہتھیار بھی استعمال کیے گئے یا یوں کہیئے کہ زمین اُن کے لئے جہنم بن گئی۔ بہر حال ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ فحاشی کی کمر توڑنے کے لئے نہایت سخت اور بے شمار طریقے ایجاد کیے گئے تھے لیکن اُن کی جڑ نہ کٹ سکی اور وہ اب تک پھلتے پھولتے چلے آ رہے ہیں۔ شوق جرم اور افلاس سے زیادہ گہرا سبب اُن کی سخت جانی میں مضمر ہے۔

جو مرد فحاشی کی سرپرستی کرتے رہے ہیں اُن کی سزائیں

قانونی حیثیت نہیں رکھتی تھیں تب بھی انھوں نے بڑے بڑے جوکھم میں اپنے آپ کو ڈالا۔ فحاشی اُن کے گہرے مذہبی عقائد اور اخلاقی اُصول کے خلاف تھے اور بعد میں اُن کو تاسف کے کرب میں مبتلا ہونا پڑتا تھا؛ وہ اپنے خاندان کی بربادی، بیوی بچّوں سے محروم ہونے کے سارے خطروں کو مول لیتے رہے حتیٰ کہ امراض خبیثہ میں مبتلا ہو جانے کا خوف بھی انھیں رنڈی بازی سے روک نہ سکا۔ اس کی وجہ گناہ پسندی اور بدچلنی سے زیادہ گہری ہونی چاہیے۔

اس معاملے میں، ہمیں ماضی سے کوئی روشنی نہیں مل سکتی۔ فحاشی کے مٹانے کے لئے ہماری موجودہ کوششیں بھی بے اثر ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ شہر کو قحبہ خانوں سے پاک کر دیا جائے۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم اس کاروبار کو زمین دوز سرنگوں میں منتقل کر کے عورتیں اور لڑکیوں میں اس وبا کو پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے اس دعوے کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ فحاشی کو جس قدر دبانے کی کوشش کی جائے اُسی قوت سے وہ اُبھرتی جائے گی۔

جب ان ساری مذلتوں، خطروں، رکاوٹوں، ظالمانہ سزاؤں جلاوطنوں اور عذاب جہنم کے خوف کے باوجود فحاشی جاری رہی تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مستقبل میں بھی جاری رہے گی اور اس لئے زندہ رہے گی کہ وہ ایک اہم حیاتیاتی ضرورت کو پورا کرتی ہے جس کی تشفی کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔

گو فحاشی ایک مطلق ضرورت ہے اور سماج کی خدمت کرنے والا ادارہ متصور ہوتا ہے لیکن وہ ایک خیر خالص نہیں ہے۔ اُس میں چند برائیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کا ازالہ ہونا چاہیئے۔ اُن کا ازالہ مسئلہ فحاشی کو دانائی کے ساتھ حل کرنے اور فاحشہ کے متعلق نقطۂ نظر بدل دینے سے ہو سکتا ہے۔

اب یہ مان لیا جانا چاہیئے کہ بیسواؤں کا پیشہ قانونی طور پر جائز ہے اور اس میں جمہور کے مفاد مضمر ہیں اگر یہ تصور اُن لوگوں کو ٹھیس نہ پہنچاتا جن کے ذہن میں روایتی عقائد جالے تن چکے ہیں تو ہم کہتے کہ اس کا شمار معزز پیشوں میں ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ممکن ہو جائے تو سماج سے متعلق بیسوا کا نقطۂ نظر فوری تبدیل ہو جائیگا۔ اُسے شائستہ انسان سمجھ کر سلوک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ شائستہ انسان کی طرح دوسروں سے سلوک کرے۔ اب ہمیں اس کے تعاقب

تحقیر اور قانونی شکنجے میں پھانسنے کی ساری کوششوں سے باز آجانا چاہیئے۔ اُسے صرف اتنا یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ جب تک کہ عام شائستگی کو اُس کے وجود سے کوئی گزند نہیں پہنچتا اُسے کسی خوف کی ضرورت نہیں۔ اس تیقن سے اُس کا حوصلہ بڑھے گا اور وہ اُن ناجائز استفادوں کی مدافعت کر سکے گی جن کی وہ اب تک شکار رہی ہے۔ اُسے قرم ساقوں کی مکروہ ترین مخلوق کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ دیگر معزز خواتین کی طرح ہر ذلت اور رسوائی سے محفوظ رہ سکیں گی۔ اس نظام کے تحت قحبہ خانوں کے مالکوں (مرد و عورت) کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لڑکیاں خود اپنے چکلوں کا انتظام کر سکیں گی اور انھیں اپنی کمائی کو صرف کرنے کی آزادی مل جائے گی۔ وہ چکلوں کی صفائی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر کافی نگرانی کر سکیں گی اور اگر اتفاق سے بیمار پڑ جائیں تو معقول معالجہ کرا سکیں گی۔ جہاں جبر و سزا کا خوف نہیں رہتا وہاں فاحشہ عورت اپنی صحت کا خاص خیال رکھتی ہے اور کسی گاہک کو اپنے امراض سے متاثر کرنا شرافت کے منافی سمجھتی ہے جیسا کہ کوئی معزز خاتون اپنے محبوب یا شوہر کو کسی

بیماری سے متاثر کرنا نہیں چاہتی۔

آج کل کی بیسواؤں کے تمدنی اور معاشی حالات کا مقابلہ ڈیڑھ سو سال پہلے کی بیسواؤں کے حالات سے کیا جائے تو بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ یعنی جو کچھ تغیرات ہوئے ہیں وہ مستحسن ہیں۔ اس لئے ہمارا یہ یقین بالکل حق بجانب ہے کہ یہ اصلاح اور ترقی جاری رہے گی حتیٰ کہ عوام کی طرز نگاہ اس قدیم ترین اور ناقابل شکست پیشے کے متعلق (جو حیاتیاتی طور پر فطری اور جسمانیاتی طور پر ضروری ہے) عقلی اور انسانیت پرور ہو جائے گی۔

پیشۂ فحاشی کی وسعتوں میں ایک اور پہلو بھی نظر آتا ہے جس کی ایمانداری اور احتیاط کے ساتھ جانچ ضروری ہے مرد پیشہ وروں کا تصور ہمارے ملک میں وہ نہیں ہے جو جرمنی، امریکہ، فرانس اور دیگر مہذب ممالک میں قائم ہے جہاں یہ لوگ آزادی کے ساتھ اپنا کاروبار چلاتے ہیں اور عورتیں اُن سے رجوع ہوتی ہیں۔ مرد پیشہ ور سے ہماری مراد بچاس فی صد فحاشی کا مرکب ہے جس کے بغیر فحاشی کا کوئی امکان نہیں مذاہب کی تعزیرات سے قطع نظر، اس پیشے کے مرد و عورت

دونوں ایک ہی گناہ کے مرتکب ہیں مگر اس کھیل کے مرد کھلاڑی کے متعلق ہماری سماج کا برتاؤ جانب دارانہ اور منافقانہ ہے۔ یہ نام نہاد سماجی برائی بہت بڑی حد تک گھٹا دی جا سکتی ہے اگر انسان، سماج اور خاتون فحاشی کے اس شریف "مرکب" سے نمٹنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

ہمارے شہر میں اس کے انسداد کی کوششیں ضرور کی گئی ہیں لیکن ان کا کیا حشر ہوا معلوم نہ ہو سکا۔ ہماری صحافت نے فرمان مبارک کے سہارے (جو تقریباً بارہ سال پہلے شرف صدور لایا تھا) بھی پیشہ فحاشی کی تنظیم اور نگرانی کے متعلق رائے عامہ کو آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر عملی طور پر کوئی قدم آج تک اٹھایا نہ جا سکا۔ وجوہ ظاہر ہیں۔ یہ امکان بھی اب کم ہوتا جا رہا ہے کہ فحاشی کے متعلق لوگوں کا قدیم تصور کبھی بدل سکے گا اور وہ اس ادارے کو کم سے کم بے ضرر بنانے کی تجویزوں پر غور کریں گے۔ کیا وہ حلقے جو فلاح عامہ کے ذمہ دار ہیں اس مسئلے کو حل کرنے کی مخلصانہ کوشش ان خطوط پر کریں گے جنھیں ہم کھینچ چکے ہیں۔

اگر ہم اپنے سائنسی، عقلی اور انسانیت پرور نقطۂ نظر کو

مختصراً بیان کرنا چاہیں تو ہم کہیں گے کہ فحاشی کا پیشہ بداخلاق، مجرمانہ اور ناعمرانی نہیں ہے۔ اس لئے اُسے دوسرے پیشوں کی طرح قانونی جواز مل جانا چاہیئے۔ چونکہ اس پیشے میں صحت عامہ کے لئے چند خطرات پائے جاتے ہیں اس لئے اُسے پولیس کے بجائے سررشتۂ طبابت کی نگرانی میں رکھا جاسکتا ہے۔ بیسوا اپنی معزز بہن کی طرح ایک ہی نوع سے تعلق رکھتی ہے۔ جسمانی اور ذہنی اخلاقیات میں وہ اپنی نوع کی کسی اوسط عورت سے بہت کم اختلاف رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ شائستگی اور انسانیت کا سلوک نہ صرف شائستگی اور انسانیت ہے بلکہ وہ عمرانی طور پر ضروری بھی ہے۔ کیوں کہ فاحشہ کے ساتھ ہمارا برتاؤ جس قدر اچھا ہوگا اس کی خودداری میں اضافہ ہوگا اور وہ سماج کی بھلائی کی طرف مائل ہوتی جائے گی اور اُس کا وجود بے خطر بن جائے گا۔ "عمرانی شر" جو فحاشی کا مترادف بن چکا ہے، ہماری سماج اور ہماری لغات سے خارج ہو جائے گا۔ وہ اگر ہوگا بھی تو بالکل متغیر اور مختلف۔

طلاق

"جو عورت مبتلا عشق ہو اس سے ہر کام ممکن ہے"

بہت سے لوگ طلاق کو خودکار گاڑیوں، ریڈیو اور طیاروں کی طرح عصر حاضر کی ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ انجیل میں مرقوم ہے کہ "جب مرد کسی کو اپنی زوجہ بنا لے اور وہ زوجہ اپنی کسی خباثت کی وجہ شوہر کی شفقت سے محروم ہو جائے تو شوہر کو چاہیئے کہ دستاویز طلاق لکھ کر اُس کے حوالے کر دے اور اُسے

ہو گا کہ وہ کسی دوسرے کی بیوی بن جائے۔"

یونانیوں اور رومیوں میں طلاق کے قانون رائج تھے جو زمانہ بہ زمانہ بدلتے رہے۔ ان قوانین کی رُو سے کوئی شخص اپنی بیوی کو گواہوں کے حضور میں بھیجنے سے طلاق دے سکتا تھا۔ اہم وجہ طلاق اگر زنانہ ہو تو جہیز کی واپسی لازمی تھی اور واپسی میں تاخیر کی صورت میں سُود بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر زوجہ عدالت کے رُوبرُو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے قابل ہوتی تو وہ بری ہو سکتی تھی۔ رومی قانون نے قدیم قانون کی جگہ ۳۳۱ ق م میں لی اور قسطنطینی بادشاہ وقت نے حکم جاری کیا کہ ہر شوہر تین اسباب زنا، زہر کی تیاری اور دلاّلی کی بناء پر اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے اگر وہ قتل کا ارتکاب کرے، زہر تیار کرے اور قبروں کی بے حُرمتی کرے۔

مسئلہ طلاق کے متعلق ہر ملک میں مختلف رائیں اور مختلف خیلات پائے جاتے ہیں۔ انگلستان میں شوہر یا بیوی کا زناکار ہونا طلاق کے لئے کافی ہے۔ پرُتگال، روس اور

حاملہ ہونا، جبر یا مکر و فریب کے ذریعہ شادی کر لینا یا پہلی شادی کو چھپا کر دوسری شادی کی کوشش کرنا داخل ہیں۔

ظلم، جسمانی ہو یا ذہنی جس سے طرفین کی آسودگی کو صدمہ پہنچے طلاق کے مسلّمہ اسباب میں شمار ہوتا ہے۔

اسلام اوپر بیان کئے ہوئے معقول اسباب طلاق کو تسلیم کرتے ہوئے بڑی فیاضی کے ساتھ محض انسانیت کے مفاد کے مدنظر طلاق کے مفہوم میں وسعت پیدا کر دیتا ہے۔

زوجین کو طلاق یا خلع حاصل کرنے کے لئے جو صورتیں شرع میں درج ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) مجبوب (مقطوع الذکر) فوری تفریق لازم ہے۔

(۲) عنین یعنی نامردی۔ مگر بغرض علاج ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ بصورت عدم صحت تفریق ہوگی۔

(۳) عجز عن النفقہ۔ کسی ایسے عضو کے معدوم ہو جانے کی شرط پر جس سے حصول نفقہ ممکن نہ ہو۔

(۴) جنون۔ جزام و برص۔ شوہر کے ایسے علل میں مبتلا ہونے کی صورت میں تفریق ہوگی بشرط عورت طالبِ تفریق ہو اور عدالت کے حاکم کی رائے میں بھی تفریق

رومانیہ میں زوجین میں سے کسی ایک کے بھاگ کھڑے ہونے پر باہمی رضامندی سے طلاق مل جاتی ہے۔ یہ غیاب جو ایک سے پانچ سال تک ہوتا ہے قانونی طور پر نان ونفقہ کا مجاز گردانتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ، جرمنی، فرانس، بلغاریہ اور امریکہ کے بہت سے حصوں میں یہی طریقہ جاری ہے۔ اس کے بعد بہت سے ممالک نے جسمانی معذوری کی بنا پر طلاق کے حصول میں سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ زناکاری تو عام وجہ سمجھی ہی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط مقرر کردی گئی ہیں کہ (۱) حصول مقصد کے لئے زناکاری کا بلاوجہ الزام نہ قائم کیا جائے۔ (۲) جرم کا علم ہو جانے کے بعد ازدواجی تعلقات ایک سال تک برقرار نہ رہے ہوں۔ (۳) مدعی خود زنا میں مبتلا نہ ہو۔

ان کے علاوہ عادتی شراب نوشی اور دیگر منشیات کی عادت بھی طلاق کی ایک وجہ گردانی گئی تھی۔ پاگل پن جسمانی معذوری کی طرح ایک عام اور اہم سبب طلاق تھا۔ دیگر اسباب میں سنگین جرائم کا الزام بیوی کا شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر کے بجائے کسی اور شخص کے ذریعہ

ضروری قرار پائے۔ یہ امر اختیار تمیزی پر ہے زنا کی تہمت شوہر لگائے اور حسب قاعدہ شرعی حلف فریقین سے لی جائے تو تفریق ہو گی۔

(۶) مفقود الخبری۔ اس میں چال سال انتظار کے بعد تفریق ہو گی

(۷) ارتداد۔ اس میں تین دفعہ فریق پر اسلام پیش کرنے کے بعد تفریق متعین ہو گی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندو بھی طلاق کے بارے میں اسلام کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ طلاق سے متعلق قرآن حکیم اور شرع میں جو احکام ہیں وہ انسانیت پرور سہل العمل اور ادارہ ازدواج کی موجودہ گندگیوں کے لئے تریاق ہیں۔ کاش کہ آج کا تہذیب زدہ' روایت پرور اور خود فریب انسان ان پر عمل پیرا ہو کر آلام انسانی میں کمی کر سکے!

گو کہ پیغمبر اسلام نے مکروہ چیزوں میں طلاق کو مکروہ ترین قرار دیا ہے مگر بشری کمزوریوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے نہ صرف اپنی تعلیمات میں بلکہ اپنی شخصی زندگی میں بھی طلاق کے جواز اور مطلقہ کے احترام کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

عصر حاضر میں طلاق کی کثرت کو وسیع النظر لوگ (جو

زندگی کو ترقی پذیر اور متغیر سمجھتے ہیں) بُرا نہیں سمجھتے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ دور معاشری اور معاشی انقلابات کا دور ہے، اور معیارِ ازدواج کا بدلنا فطری اور ناگزیر ہے۔ یہ وقت کی علامت ہے اور بہت اچھی علامت ہے۔ ازدواجی ادارے کو بدلنا ہی چاہیئے۔ دنیا اس کی تنسیخ کے لئے تیار نہیں ہے۔ لیکن ازدواجی بندھنوں کا آزادی کے ساتھ کھُل جانا (جنھیں جذباتی جواز بھی حاصل نہ ہو) ازدواجی ادارے کے لئے خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس وہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس ادارے کی حفاظت صرف اس کا شرف کر سکتا ہے۔ ایک شریف تعلق ازدواج دو آہم آہنگ روحوں کا وصل ہے۔ طلاق اس تعلق کو منقطع نہیں کر سکتی۔ باقی سارے تعلقات "جھوٹی شادیاں" ہیں اور اُن کا بُطلان ازدواجی ادارے کی بقا کا موجب ہے۔ ممالک متمدنہ میں طلاق کی کثرت کے اسباب یہ ہیں:۔

(۱) عورت کی حیثیت کا بدل جانا

(۲) سیر و سیاحت کی سہولتیں

(۳) تعلیم کی سہولتوں سے انفرادی زاویہ نظر کی وسعت میں اضافہ۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی کی علیحدگی سے بچوں کا حشر کیا ہوتا ہوگا؟ میری رائے میں بعض حالات میں ماں باپ کی علیحدگی بچوں کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے بجائے، رحمت ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ کوئی بچہ ماں باپ کے کشیدہ تعلقات کے سائے میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ نفسیات اور بہبودی اطفال کے مطالعات کا یہی فتویٰ ہے۔

ایک ذی فہم قاری میری تائید کرے گا کہ طلاق ایک قسم کا زائدے کا التہاب (Appendecitis) ہے۔ مگر ہمارے بزرگان قوم یہ نہیں مانیں گے کہ اس مرض کا آخری علاج عمل جرّاحی ہے۔ ان کا استدلال یہ بھی ہوگا کہ پہلے یہ مرض نہیں تھا اور اب کہاں سے آگیا۔ مگر وہ کیا جانتے ہیں کہ گذشتہ تین چار ہزار سال کے دوران میں کتنے لاکھ انسان اس مرض کے شکار ہو گئے۔

ہمارے قدامت پرست شہری اسی کٹ حجتی سے کام لیکر طلاق پر رائے زنی کرتے ہیں کہ ہمارے اسلاف جب ایک بار کسی کو شوہر یا بیوی بنا لیتے تو پھر اس "ربانی اتحاد" کو توڑ دینا کفر سمجھتے یہ طرز ان کی جہالت کا ثبوت ہے۔ کاش وہ یہ جانتے

کہ جہالت، عقیدہ پرستی اور خوف کے باعث ہزاروں بد رفاقت کے شکار التہاب (Appendicitis) کے مریضوں کی طرح ناقابل برداشت مصیبت برداشت کرتے ہیں اور انجام کار موت ان کی نجات کا باعث بنتی ہے۔

میں طلاق کی مدافعت نہیں کر رہا ہوں۔ میں اُسے صاف ستھرا عمل جراحی سمجھتا ہوں۔ میں قارئین کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ طلاق کو ہم پسند کریں یا نہ کریں، طلاق ہمارے سامنے کھڑی ہے اور متمدن ممالک میں اُس کی کثرت بے اندازہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ طلاق نے ہماری سماج میں اپنی جڑیں مستحکم کرلی ہیں۔ جو لوگ اپنی ازدواجی تقدیر پر قانع ہو چکے ہیں اُن پر خدا رحم کرے، لیکن ہمارے بہت سے بھائی اور بہنیں کیوں اس بدبختی پر قانع ہوں؟ کیوں وہ اُسے دور کرنے کی کوشش نہ کریں؟ ہم کیوں نہ طبیب سے رجوع ہو کر اپنے مرض کا ازالہ کریں؟ ممکن ہے کہ ہمیں سنگین عمل جراحی (طلاق) کی ضرورت ہو تاکہ ہماری جان بچ سکے۔ جو لوگ ابھی متاہل نہیں ہوئے ہیں، انھیں پہاڑ پر چڑھنے سے پہلے اپنی حدود اور پہاڑ کے بکٹ راستوں کا اندازہ کرلینا چاہیئے۔ جو لوگ

شادی کرنے کے بعد ناکام ہو چکے ہیں، انھیں پوری سنجیدگی کے
ساتھ مسئلہ طلاق پر غور کرنا چاہئے۔
اسلام جیسے آزاد مذہب کے نزدیک جس میں اوپر
بیان کئے ہوئے حالات کے تحت طلاق واجب سمجھی جاتی
ہے، منافقت، شرم و حیا کا جھوٹا احساس اور خود فریبی انسانیت
کے خلاف بمنزلۂ جرم سمجھے جاتے ہیں اسلام کے دور اول میں
قاضی کے ذریعہ عمل طلاق کتنا آسان تھا مگر آج جھوٹے خوف
کے تحت اخلاق کے معیارات بدل گئے اور اُن کے عواقب
سے ہم دوچار ہو گئے ۔ دارالقضاء پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ
غیر آسودہ شادیوں کی اکثریت کے مقابلے میں طلاقوں کی تعداد
بہت ہی قلیل ہے اور پھر ان طلاقوں کی منظوری میں تاخیر کی
وجہ جانبین کے آلام میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ "تاخیر عدل
حرمانِ عدل کے مترادف ہے"۔ پس ان حالات کے تحت
کیا سماج کو شرم نہ آئے گی کہ وہ بڑھتی ہوئی زناکاری اور
فحاشی کو قبول کرلے؟*
اعداد سے واضح ہوگا کہ عقد خوانیوں کے مقابلہ میں

---

* ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۲

دائر شدہ مقدمات کی تعداد کس قدر حقیر ہے اور اگر دار القضار میں رجوع شدہ مقدمات کی تعداد کو معیار تاشادی تصور کرلیا جائے تو جملہ عقد خوانیوں کی تعداد کے مدنظر میں یہ کہنے میں دریغ نہیں کروں گا کہ دنیا جنت سے بہت زیادہ بہتر جگہ ہے مگر افسوس ہے کہ واقعات اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

چند نیک نفس اور ذمہ دار اصحاب کی تحریک اور کوشش کے باعث حیدرآباد میں صدارت العالیہ کا یہ حالیہ تصفیہ قابل تحسین ہے کہ طلاق اور خلع کا فیصلہ اور رجسٹری بغیر عدالتی کارروائی کے کسی قاضی کے پاس بھی ممکن ہے۔ اس عمل سے ایسے موذی شوہروں کے دانت کھٹے ہو گئے ہوں گے جو ہمیشہ یہ کہہ کر عورت پر اپنی فوقیت جتاتے ہیں کہ اگر مرد چاہے تو عورت کو عمر بھر معلق رکھ سکتا ہے۔ اس عمل سے ایک طرف تو غیر آسودہ ازدواج کی خاموشی اور آسانی سے تنسیخ ہو سکے گی جیسا کہ ماضی میں ہوتا تھا اور دوسری طرف ایسی شادیوں کے جاری رہنے کی وجہ جو معیار اخلاق پر ضرب کاری لگ رہی ہے اس سے سماج رفتہ رفتہ پاک ہوتی جائے گی۔

روس میں بھی جہاں قدیم معاشری نظام کی جگہ نئے

نظامِ زندگی نے لے لی ہے، خاندانی نظام میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ازدواج محض رسمی بن گیا ہے اور رائے سے حکومت کی مداخلت سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ شادی شدہ جوڑے کے لئے اتنا ضروری ہے کہ وہ اپنی شادی کو کچھ فیس ادا کر کے رجسٹر کرالے۔ جو جوڑے متحدہ رفاقت میں کچھ دن گزار لیں، وہ خود بخود شادی شدہ جوڑوں میں رجسٹر ہو جاتے ہیں۔ طلاق کے لئے بلا عذر یک طرفہ اعلان کافی سمجھا جاتا ہے۔ بیوی حقوق اور فرائض کے لحاظ سے اپنے شوہر کے مقابلہ میں مساوی درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ان سب خارجی اور قانونی بندھنوں کے فقدان کے باوجود، روس میں ازدواجی ادارہ قدامت پرست کسانوں سے، شہری مزدوروں اور عہدہ داروں میں مقبول ہے انقلاب کے عبوری دور کی جنسی طوائف الملوکی کے بعد ازدواجی ادارہ ایسا مستحکم ہو گیا کہ مغربی ممالک کے مقابلے میں روس کی ان بیاہی ماؤں اور ان بیاہی فاحشات کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ روسی نوجوان کے اخلاقی کردار میں کوئی اصلاح ہوئی ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ جنسی تعلق اور شادی ایک دوسرے کے مترادف بن گئے ہیں اور روایتی

ازدواج کی خارجی اہمیت باقی نہیں رہی۔ صرف اُسے ایک واقعہ کی حیثیت حاصل ہے۔

روس سے ہم نے جو نئی بات سیکھی وہ یہ ہے کہ خارجی جبر کے ازالے سے آزاد شادیوں کا رواج عام ہو گیا اور ازدواجی نظام کی معقول اصلاح سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان کے لیئے یک زوجیت ہی بہترین اسلوبِ زندگی ہے۔ ممکن ہے کہ جنسیات کے نام نہاد انقلاب پسند ہماری رائے سے اختلاف کریں۔

زناشوئی نزاعات کے زندان میں پڑے ہوئے نوجوان قیدیوں پر غم و غصہ کا اظہار مرض کا اصلی مداوا نہیں ہے۔ طلاق ہی ہماری خانگی تلخیوں اور زہرناکیوں کی تریاق ہے۔ "جسم پر نفس کی فوقیت" کے نظریئے کے تحت ضبطِ نفس کا وعظ انسانی ربط اور عملی زندگی میں شاذ ہی کارگر ہوتا ہے۔ طلاق کو ہر مہذب ملک نے تسلیم کر لیا ہے اور اس پر عمل پیرا بھی ہے۔ اس کے خلاف انسانی زندگی کے مختلف عناصر کا گہرا مطالعہ کیئے بغیر تاویلات پیش کرنا فہمِ عامہ کے خلاف جانا ہے۔ طلاق بچے کی پیدائش کی طرح معاشرے میں مقدس اور خطرناک دونوں پہلو رکھتی ہے۔ طلاق ناگزیر ہونے پر بھی، اُس سے بچنے کی

منافقانہ کوششیں کی گئیں اور زناکاریوں اور بے شمار اموات کے دروازے کھول دیئے گئے۔ ہم طلاق کو نفرت کے ساتھ اپنے دامن سے جھٹک نہیں سکتے۔ مذاہب اور قوانین نے فطرت انسانی کے تنوع اور پیچیدگی کو نظر میں رکھ کر ہی طلاق کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ صحیح یا غلط، طلاق ہمارے معاشرے کی عمارت کا بنیادی پتھر بن رہی ہے اور ہمارے شہریوں کی گہری اور منطقی دلچسپی کی مستحق ہے۔

مجھ پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی ہے جب میں ایسے نقطے پر پہنچتا ہوں جہاں مجھے اپنا قلم روک لینا چاہیئے میں اُس مقرر کی طرح ہوں جو اپنے مقررہ وقت کو اصل موضوع سے رجوع ہونے کی تیاری میں صرف کردے۔ بلکہ میں ایک بھگت کی طرح پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا ہوا ہوں اور ہر رہرو کو اپنے فلسفہ کا ایک گھونٹ پلاتا جا رہا ہوں۔ اشاعت کی دقتیں، جانچ پڑتال، روایات اور سماجی اخلاقیات مل کر میرا منہ بند کر دیتے ہیں اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں کہہ نہیں سکتا۔ انسانوں کی نفسیات اور ازدواج و طلاق کی جڑیں ہماری زندگی کی تہہ زمین تک اُتری ہوئی ہیں۔ مشاہدوں سے

مواقع اور ننگی انسانیت کے تلخ تجربات سے جو اس کتاب کو جنم دینے کے موجب ہیں، میں اس قابل ہوں کہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے مرد و عورت کی دھندلی تصویر بھی دیکھ سکوں۔ اُن کے شفاف چہروں پر آنسو اور مسکراہٹ، مسرت اور غم امید و بیم جھلک رہے ہیں۔ اُن کے طرز لباس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خودکار کلوں، تھیٹروں، طیاروں جنگ و جدل، سیاسیات، موانعات، قیاسات، نشریات، اخبارات اور ہمارے عجیب و غریب تمدن کے ہزاروں کرشموں کے دور میں پیدا ہونے والی مخلوق ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی مستقبل سے ملانے والی یقینی کڑی ہے؟ بیسویں صدی کی ساری ہنگامہ آرائیاں پچاسویں صدی سے پہلے ختم ہو جائیں گی۔ لیکن مرد و عورت کے باہمی تعلقات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ یہی ایک تعلق ہے جو مجھے انسانوں کے اُداس چہروں کی اصلیت معلوم کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔

اُس جم غفیر سے قطع نظر جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے، میں ایک اجتماع عظیم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ ان میں اکثر نوجوان متاہل جوڑے، غیر متاہل انسان، اور پیدا

ہونے والے بچے ہیں۔ وہ میری حدِّ نظر سے دور نہیں ہیں۔ اُن کے چہروں پر سراسیمگی اور ہراس کی صاف علامتیں نظر آرہی ہیں۔ وہ حیرت میں پڑے ہوئے سوچ رہے ہیں کہ ان میں کیا خامی ہے، ان کے خواب پارہ پارہ کیوں ہوگئے؟ آخر اُن کی زندگی میں کیا نقص ہے؟ اگر مجھے ان سے بات چیت کا موقع بھی ملے تو میں اُن سے ہر بات کہہ دینے پر مائل نہیں ہوں۔ البتہ میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا۔ صرف میں ہی اُنھیں مخاطب کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ بڑی دیر سے اور بہت دُور سے اُن کے گوش شنوا پر آوازیں آآکر دم توڑ رہی ہیں اور وہی باتیں کہہ رہی ہیں جنھیں میں کہنا چاہتا ہوں

اخلاقیات کا کہنا ہے کہ جنس ایک ناپاک شئے ہے۔ اُسے اعتراف ہے کہ استقرارِ حمل کی میکانیت نوع کے لئے بہت اہم ہے۔ اس پر بھی وہ اعضائے جنس کو حرمانِ انسانیت کا جزوِ اعظم سمجھتی ہے۔ وہ ہمیں جھوٹی حکمت اور عفت کا حامل بنانا چاہتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ چند باہمت انسان اُٹھیں اور اپنی گھن گرج آواز سے سب کو دہلا دیں۔

بلند حوصلہ ماں باپ اپنے بچوں کو سمجھائیں کہ جنس کا جادو

نہایت حسین اور لائق قدر ہے۔ مفکرین، فہم عامہ سے کام لے کر کوشش کریں کہ لوگ ضبط تولید کی افادیت تسلیم کر لیں۔ استاد مدرسوں میں جسمانیات پر درس دیں۔ پاکیزہ دل و دماغ رکھنے والے نوجوان اپنے بزرگوں سے زندگی کے گہرے حقائق پر بحث کر کے، سکتے ہیں ڈال دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری یہ جرأت آنے والی نسل کو صحت مند بچے دے سکے گی۔ اب اخلاقیات جو کئی مکر و فریب کی پیداوار ہے، دہشت سے پیلی پڑ چکی ہے۔ ان مسائل سے ہٹ کر میری توجہ ان آلام پر جمی ہوئی ہے جو انسانی تعلقات میں پائے جاتے ہیں۔ ناموزوں اشخاص کے درمیان ازدواجی تعلقات! بعض لوگ ازدواج کو بُری طرح نبھاتے ہیں اور بعض ایک ہی سال کے بعد پریشان کن تغیرات محسوس کرتے ہیں۔ تربیت سے ان سب کی دستگیری کی جا سکتی ہے۔

خود ازدواج، کو انسان نے اپنی سہولت کی خاطر گھڑ لیا ہے۔ انسان کی دوسری ایجادوں کی طرح یہ ایجاد بھی اہم اور لائقِ تحفظ ہے بشرطیکہ وہ اپنے مقصد کو

پورا کر رہی ہو۔ طلاق جو ازدواج کا ایک جزو ہے، مساوی طور پر اشیار کے اعلیٰ منصوبے میں غیر اہم ہے۔

مرد و عورت کے درمیان گہری اور آسودہ رفاقت خواہ تناسل کے لئے ہو یا حظِّ نفس کے لئے، ہر حالت میں اہم ترین ہے۔ اگر یہ رفاقت آسودگی کے ساتھ ساتھ محبت اور اس کی مسرّت بھی پیدا کر سکے تو کیا کہنے۔ محبت کی مسرت زندگی کا سب سے بڑا انعام ہے۔ کام، صحت، دولت، بے غرضی اور دوسری نعمتیں آستانِ محبت پر جبیں سائی کرتی ہیں۔ محض ازدواج اس کے حصول اور حفاظت کا وسیلہ نہیں ہے۔ اولاد بھی اس کے لئے لازمی نہیں ہے۔ محبت زندگی کی طلسمی چنگاری کی طرح، ایک سربستہ راز اور ایک جوہری قوت ہے۔ ہمارے ازدواج و طلاق کے بھونڈے مصنوعات کا تعلق اُس کی طاقت اور حُسن سے اتنا ہی کم ہے جتنا کہ ان پودوں کا تعلق شاہ بلوط کے چھتنار درخت سے ہوتا ہے جو اس کے سائے میں اُگتے ہیں۔

Mohd. Yaqub Shopiany
10/9/61

ضمیمہ ۱

عقد خواہوں کا سالانہ اوسط بلدہ وحوالی بلدہ میں	۳۵۰۰
" " اضلاع میں	۱۵۵۰۰
تصدیق شدہ طلاق ناموں کا سالانہ اوسط	۸۱

تختہ مقدمات متدائرہ منفصلہ (خلع وطلاق) محکمہ دارالقضاء بلدہ سرکار عالی
عن ابتدائے ۱۳۴۸ ف لغایۃ ۱۳۵۷ ف

صراحت سنہ	مقدمات متدائرہ		مقدمات خلع منفصلہ			مقدمات طلاق منفصلہ			جملہ مقدمات منفصلہ	اوسط ایام دوران فی مقدمہ
	خلع	طلاق	ڈگری شدہ	خارج شدہ	[illegible]	ڈگری شدہ	خارج شدہ	[illegible]		
۱۳۴۸ ف	۷	۲	۳	۲	۲	۲	٠	٠	۹	۲۶۸
۱۳۴۹ ف	۴	٠	۲	۲	٠	٠	٠	٠	۴	۲۱۳
۱۳۵۰ ف	۲	٠	۱	۱	٠	٠	٠	٠	۲	۲۳۶
۱۳۵۱ ف	۷	٠	۲	۲	۳	٠	٠	٠	۷	۲۰۰
۱۳۵۲ ف	۷	٠	۴	۱	۲	٠	٠	٠	۷	۱۷۶
۱۳۵۳ ف	۵	٠	۲	٠	۳	٠	٠	٠	۵	۸۷
۱۳۵۴ ف	۵	۱	۲	۲	۲	٠	٠	٠	۶	۹۵
۱۳۵۵	۵	۱	۴	٠	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۶	۵۹
۱۳۵۶ ف	۶	٠	۳	٠	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۶	۱۰۵
۱۳۵۷ ف	۷	٠	۲	۱	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۷	۷۰
میزان صدر دس سالہ	۵۵	۴	۲۵	۱۱	۱۴	٠	٠	٠	۵۹	۱۵۱ فی مقدمہ